تعلیم و تربیت
اگست
2010
محمد عاصم
آزادی نمبر
غلامی
ایک پُراثر کہانی، صفحہ 5

معیاری کتابیں

دل چسپ سائنسی معلومات

کئی سوال کئی جواب

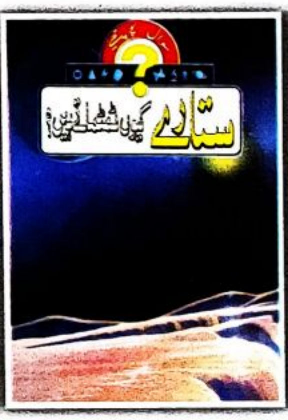

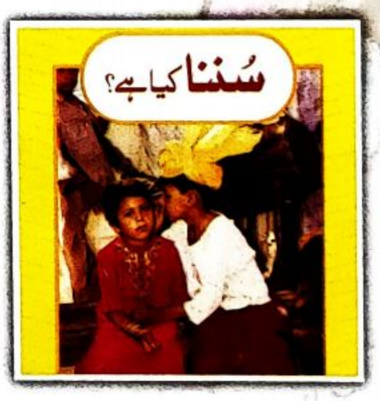

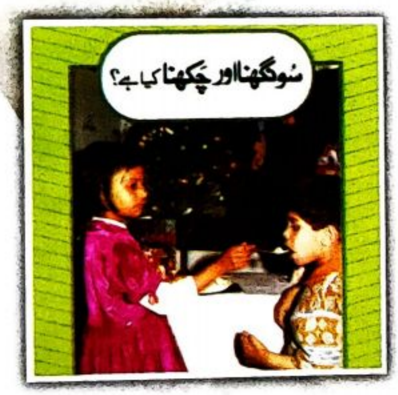

- دیکھنا کیا ہے؟ - سُونگھنا اور چکھنا کیا ہے؟ - سننا کیا ہے؟ - ستارے کیوں ٹمٹماتے ہیں؟
- موسم کیوں بدلتے ہیں؟ - آواز کیا ہے؟ - ہَوا کیا ہے؟ - نیند کیوں ضروری ہے؟

فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی

70 واں سال چوتھا شمارہ

(رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی)

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا

بچوں کا محبوب رسالہ

تعلیم و تربیت

اگست 2010ء

محمد عاصم

اس شمارے میں

اداریہ	مدیر	1
درسِ قرآن وحدیث	سید مقبول حسین شاہ	2
حمد	ڈاکٹر خواجہ عابد نظامی	3
۱۴ اگست ۱۹۴۷ء	حفیظ الرحمٰن احسن	4
غلامی	علی اکمل تصور	5
رمضان المبارک	محمد عالم میواتی	10
مفید مشغلے	غلام حسین میمن	11
چُن بُن	ناصر ملک	13
روشن دل	محمد فاروق دانش	14
اندھا اعتماد	اشتیاق احمد	19
کھیل اور کھلاڑی	نسرین شاہین	22
پاک سرزمین شاد باد	محمد ظریف خان	25
یہ کیا ہوا؟	فارح فجیع	29
معمارِ وطن	ضیاء الحسن ضیاء	32
ایک سبق نیا	جدون ادیب	33
بچوں کا انسائیکلو پیڈیا	طارق ریاض خان	36
سیاچن گلیشیر	معاذ فاروق	38
ہمارا پرچم، یہ پیارا پرچم	محمد خلیل چودھری	40
داوٗدی علمی آزمائش	ذہین قارئین	42
صلح صفائی	کلیم چغتائی	43
بائیکاٹ	عادل منہاج	46
آپ بھی لکھیے	ہونہار ادیب	51
آپ کا خط ملا	ننھے قارئین	55
رکھوالے	نذیر انبالوی	57
ہونہار مصور	ننھے مصور	63
بلا عنوان	ننھے خوشہ چیں	64

اور بہت سے دل چسپ تراشے اور سلسلے

سرورق: ”آزادی نمبر“

قیمت فی پرچہ 25 روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ !

اُمید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔

ایاز میرے سامنے بیساکھیوں کے سہارے مشکل سے چل رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ رک گیا۔ علیک سلیک کے بعد اُس نے کہا: ”بھیا! کیا آپ میرا ایک کام کریں گے؟“

”بولو کیا کام ہے؟“

”میرا ایک پیغام اپنے رسالے میں شائع کر دیں۔“ ”کیسا پیغام؟“

”پیغام یہ ہے کہ یومِ آزادی پر نوجوان موٹر سائیکلوں کے سائیلنسر نکال کر ون ویلنگ نہ کریں، پچھلے سال میں بھی آزادی کا جشن مناتے ہوئے ون ویلنگ کرتے ہوئے فٹ پاتھ سے ایسا ٹکرایا تھا کہ آج تک اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکا۔ یہ بیساکھیاں نہ جانے کب تک میرا سہارا بنی رہیں گی۔“ یہ کہہ کر ایاز زار وقطار رونے لگا۔

”میں تمہارا یہ پیغام ضرور شائع کروں گا۔“

ساتھیو! میں نے ایاز سے کیا وعدہ پورا کر دیا ہے، ایاز نے جو پیغام دیا ہے اس پر غور کیجئے اور یومِ آزادی منانے کے جوش میں ہوش کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیجئے۔

یومِ آزادی ہر سال ہمیں اُس عہد کی یاددہانی کراتا ہے جو ہم نے اپنے عظیم قائد کی قیادت میں ایک آزاد قوم کی حیثیت سے اسلامی اقدار کی پاسداری کے لیے کیا تھا۔ اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر اور امن وسلامتی کا پرچم بلند کر کے ہی ہم کام یابی کی منزلیں طے کر سکتے ہیں اور یہی یومِ آزادی کا اصل تقاضا ہے۔ ہماری طرف سے آپ سب کو یومِ آزادی مبارک ہو۔

اس ماہ کے وسط سے رمضان المبارک کے مقدس مہینے کا آغاز ہو گا۔ اس مہینے کے تقدس کا خیال رکھیں اور اس کی مبارک ساعتوں سے زیادہ سے زیادہ فیض یاب ہونے کی کوشش کریں۔

اب آپ ”آزادی نمبر“ پڑھیے اور اپنی آراء وتجاویز سے آگاہ کیجئے۔

خوش رہیں، شاد رہیں اور آباد رہیں   فی امان اللہ (ایڈیٹر)

چیف ایڈیٹر	ایڈیٹر، پبلشر	اسسٹنٹ ایڈیٹر	مشیر خاص	مشیر	سرکولیشن اسسٹنٹ
عبد السلام	ظہیر سلام	نذیر انبالوی	سید مقبول حسین شاہ	سعید لخت	محمد بشیر راہی

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشگی بنک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر: ماہنامہ ”تعلیم وتربیت“ 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔

فون: 36361309-36361310 فیکس: 6278816

پرنٹر: ظہیر سلام
مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائداعظم، لاہور۔

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک)= 500 روپے۔
مشرقِ وسطیٰ (ہوائی ڈاک سے)= 1250 روپے۔

ایشیاء، افریقا، یورپ (ہوائی ڈاک سے)= 1250 روپے۔
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے)= 1500 روپے۔

ماہنامہ تعلیم وتربیت 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور
UAN: 042 - 111 62 62 62 Fax: 042 - 6278816
Email: tot.tarbiatfs@gmail.com
tot.tarbiatfs@live.com

بچوں کے لیے
درسِ قرآن و حدیث

تعلیم کا مقصد

سید مقبول حسین شاہ

ہر ماں باپ کی خواہش ہوتی ہے کہ اُن کے بچے تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوں اور دُنیا کی زندگی میں وہ کام یاب وکامران ہوں۔ اُن کو کوئی مالی پریشان نہ ہو۔ بڑے ہو کر وہ دربدر کی ٹھوکریں نہ کھائیں بلکہ ایک اچھی زندگی بسر کریں۔ جب ماں باپ بوڑھے ہو جائیں تو وہ اُن کا سہارا بنیں اور اِس طرح اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کریں۔

تعلیم کا مقصد محض دولت حاصل کرنا نہیں بلکہ اِس کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ انسان میں عقل وشعور پیدا ہو، وہ اچھے اور بُرے میں تمیز کر سکے، وہ اپنے علم کی روشنی دُوسروں تک پہنچاتے ہوئے اُن کی صحیح راہنمائی کر سکے اور مُلک وقوم کی خدمت بڑے خلوص، محبت اور دیانت داری سے کرے۔ اگر ہر شخص کی سوچ یہ ہو تو ملک اور قوم وملت کی ترقی میں کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی۔ حضرت علامہ اقبالؒ نے درست فرمایا ہے:

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

یعنی ہر شخص اگر صحیح تعلیم حاصل کرے اور اُس کے مقاصد نیک ہوں تو وہ قوم وملت کے لئے ایک چمکتا ہوا ستارہ ہے جس سے اندھیرے دُور ہوتے ہیں، فضا روشن ہوتی ہے اور ملک اور قوم ترقی کی راہ پر گامزن ہو جاتے ہیں۔

رسول کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ تعلیم حاصل کرو خواہ اِس کے لئے تمہیں چین جانا پڑے۔ مقصد یہ ہے کہ علم حاصل کرنے کی جستجو میں کوئی چیز حائل نہ ہو۔ ہر شخص کے دل میں یہ جذبہ ہونا چاہیے کہ اُس نے وہ علم حاصل کرنا ہے جو اُس کے اپنے لئے، اُس کے گھر والوں کے لئے اور دُوسروں کے لئے فائدے کا باعث ہو اور وہ ایک اچھا نیک اور باوقار شہری بن کر زندگی بسر کرے۔ لوگ اُس کی عزت کریں اور وہ ایسے بھلائی کے کام کرے جس سے اللہ تعالیٰ اُس سے خوش ہو۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

سورۂ بقرہ آیت ۱۰۲: ”اور (وہ لوگ اپنا بُرا کرتے ہیں جو) سیکھتے ہیں وہ علم جس سے اُن کو نقصان ہے اور فائدہ نہیں۔“

چنانچہ ایسا علم حاصل کرنا چاہیے جس سے اپنا اور دُوسروں کا فائدہ ہو۔ اِس کے لئے ضروری ہے کہ انسان دُنیاوی علوم کے ساتھ دینی علم بھی حاصل کرے۔ قرآن مجید اور صحیح احادیث میں جو اَچھی اَچھی ہدایات ہیں اُن کا اُس کو علم ہو تاکہ اُن پر عمل کرتے ہوئے وہ ایک اَچھی اور پاکیزہ زندگی بسر کر سکے۔ اُس کو دُنیا میں ایک اچھا اور باعزت مقام حاصل ہو اور اُس کے اَچھے اعمال اُس کو جنت میں لے جائیں۔ عبادت کا مقصد بھی یہ ہے کہ ہم ایک اَچھے، نیک اور باشعور انسان کے طور پر زندگی بسر کریں اور اللہ تعالیٰ اور رسول کریمؐ نے ہمیں جو اَچھی اَچھی نصیحتیں کی ہیں اُن پر ہم بڑے خلوص سے عمل کریں۔ اِس کے بغیر عبادت کا جو مقصد ہے وہ پورا نہیں ہوتا۔

پیارے بچو! آپ اپنے وطنِ عزیز پاکستان کا مستقبل ہیں۔ دُعا ہے کہ آپ تعلیم حاصل کرنے کے لئے خوب دل لگا کر محنت کریں تاکہ آپ ایک تعلیم یافتہ اور اَچھے انسان بن کر اپنے پیارے وطن کی خدمت کر سکیں۔ آمین۔

حمد

یا اللہ ! یا اللہ ! سب پہ کرم فرما اللہ !
تُو نے ہاتھ اور پاؤں دیئے احسان ہے تیرا یا اللہ !
جب کوئی مشکل پڑتی ہے کہتے ہیں ہم یا اللہ !
ہم کو بخشیں دو آنکھیں شکر ہے تیرا یا اللہ !
بولنے کو بخشی جو زباں تحفہ ہے تیرا یا اللہ !
لب بخشے ، ترا ذکر کریں کہتے رہیں ہم یا اللہ !
سچ ہے جو بھی شے بخشی
انعام ہے وہ تیرا یا اللہ

ڈاکٹر خواجہ عابد نظامی (لاہور)

۱۴ اِگست ۱۹۴۷

۱۴ اگست ، واقعی ہے یادگار دن
تاریخِ ملک و قوم میں اِک شان دار دن

انگریز کی غلامی سے اِس دن ملی نجات
نُورِ سَحر میں ڈھل گئی غم کی سیاہ رات

تھے ملک و تاج اپنے ، مگر ہم سے چھن گئے
شکرِ خدا کہ آج غلامی کے دن کٹے

غیروں کے ہم غلام ہوں ، زیبا نہ تھا ہمیں
بن کر غلام جینا تو جچتا نہ تھا ہمیں !

ربِ علا کی شانِ کرم آئی جوش میں
سوئی پڑی تھی قوم ، جو آئی وہ ہوش میں

آزاد ہو کے جینا ہے ، یہ عزم کر لیا
اک عہدِ نو سے ، قوم نے دامن کو بھر لیا

کشتی کے ناخدا تھے محمد علی جناح
بے مثل رہ نُما تھے محمد علی جناح

ہم ساحلِ مراد پہ پہنچے ہزار شکر !
واجب ہے ، ہم خدا کا کریں بار بار شکر

چودہ اگست کا ہے یہ تحفہ حسیں وطن
شاداب و بامُراد رہے اپنا یہ چمن !

نورِ سحر: صبح کی روشنی
ربِ علا: اعلیٰ مرتبے والا رب
ناخدا: ملاح، کشتی چلانے والا

حفیظ الرحمٰن احسن، لاہور

غلامی

محمد عاصم

علی اکمل تصور (قصور)

لالی جان لیوا حملے کا شکار ہوا تھا اور اب وہ اپنی جان بچانے کے لیے جدوجہد کر رہا تھا۔ صبح جب وہ خوراک کی تلاش میں نکلا تھا تو اُسے اندازہ تک نہیں تھا کہ وہ خود بھی کسی کی خوراک بن سکتا ہے اور اب مصیبت اُس کے سر پر رقص کر رہی تھی۔ وہ تھک چکا تھا، لیکن جان بچانے کی جدوجہد تو اُسے اپنی آخری سانس تک کرنا تھی۔ اُس نے ایک لمبا غوطہ لگایا۔ شکاری پرندہ اپنی نوکیلی چونچ اور پنجوں کے ساتھ اُس کے تعاقب میں تھا۔ اُس کی رفتار بھی غضب کی تھی۔ ایک بار لالی کو پنجوں میں دبوچنے کی دیر تھی۔ پھر وہ اپنی چونچ سے لالی کو چیر کر رکھ دیتا۔

شکرے کی پرواز میں تیزی ضرور تھی۔ لیکن لالی کی پرواز میں توازن تھا۔ وہ کمال مہارت سے پرواز کے دوران مخالف اطراف میں غوطہ لگا جاتا تھا۔ یوں شکرے کا ہر حملہ ناکام ہو رہا تھا۔ اب لالی نیچی پرواز کر رہا تھا۔ اُسے سامنے ایک باغ نظر آیا۔ جان بچانے کے لیے اُسے اس باغ میں پناہ مل سکتی تھی۔ لالی نے اپنے جسم کی تمام قوت کو بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ شکرے کو بھی سمجھ آگئی تھی کہ لالی اگر باغ میں پہنچ گیا تو شکار ہاتھ سے نکل جائے گا۔ اُس نے طوفانی انداز میں ایک اور حملہ کیا۔

''چیں...... چیں......'' یہ شکرے کی للکار تھی۔ لالی کا دل کانپ کر رہ گیا۔ لالی نے اپنے پروں کو سمیٹ کر ایک لمحے کے لیے اپنی رفتار کم کی اور ساتھ ہی ایک چھوٹا سا غوطہ لگایا۔ شکرے کے نوکیلے پنجے لالی کے جسم کو چھو کر گزر گئے۔ اس سے پہلے کہ شکرا پلٹ کر حملہ کرتا۔ لالی تیز رفتاری کے ساتھ باغ میں گھس گیا۔ باغ کی حفاظت پر مامور مالی نے شکرے کو ایک معصوم سے کبوتر پر حملہ کرتے دیکھ لیا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شکرے کو بھگانے کے لیے آگیا تھا۔ اُن کے پاس ایک مخصوص قسم کی غلیل تھی۔ پھلوں کو پرندوں سے بچانے کے لیے وہ اس غلیل سے مدد لیتے تھے۔ اُس غلیل سے نکلنے والے ''چوے'' میں اتنی طاقت ہوتی تھی کہ کسی انسان کی ہڈی توڑ دے۔ شکرا ڈر کر واپس لوٹ گیا۔

''کبوتر کہاں گیا......؟''

مالی اپنے ساتھیوں سے پوچھ رہا تھا۔ لیکن کسی نے لالی کو درخت کے تنے میں چھپتے نہیں دیکھا تھا۔ تھوڑی دیر کی تلاش کے بعد سب اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ لالی اب خطرے سے باہر تھا۔ اُسے بہت زیادہ اڑنے کے باعث بھوک لگ رہی تھی۔ صبح سے اُس نے کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ وہ ہمت کر کے سوراخ میں سے باہر نکل آیا اور پھر درخت کی ایک بلند شاخ پر آبیٹھا۔ ہر طرف امن تھا، سکون تھا۔ اب کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اُس نے غور سے دیکھا۔ مغرب کی طرف شہر کے آثار نظر آرہے تھے۔ لالی نے سوچا یہاں اُسے ضرور کچھ کھانے کو مل جائے گا۔ پھر وہ اپنے گھر واپس لوٹ جائے گا۔ جو اب بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ پھر وہ شہر کی طرف پرواز کرنے لگا۔

لالی نے آزاد فضاؤں میں آنکھ کھولی تھی۔ شہر سے بہت دُور ایک گاؤں کے پاس کھنڈر میں اُس کا گھونسلہ تھا۔ وہ شہر کے قریب پہنچا اور پھر خوشی سے جھوم اٹھا۔ اس جیسے بہت سے کبوتر فضا میں پرواز کر رہے تھے۔ وہ بھی اُن میں شامل ہو گیا۔ لالی نے غور کیا تمام کبوتر ایک دائرے میں پرواز کر رہے تھے، نیچے ایک مکان کی چھت پر اُسے ایک بڑا سا پنجرہ رکھا نظر آیا۔ چند کبوتر پنجرے اور چھت پر گھوم پھر رہے تھے۔ لالی سمجھ نہیں پایا کہ معاملہ کیا ہے۔ پھر اُسے ایک آدمی نظر آیا۔ وہ چھت پر دانہ پھینک رہا تھا۔ تمام کبوتروں نے پر سمیٹے اور چھت کی طرف غوطہ لگایا۔ لالی بھی اُن کے ساتھ ہی چھت پر اتر آیا۔ وہ بھوکا تھا خوراک دیکھ کر اُس کے دل میں لالچ پیدا ہو گیا تھا۔ ویسے بھی اپنے ساتھیوں کی موجودگی میں اُسے خطرے کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ دُوسری طرف خطرہ دبے پاؤں اُس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دانہ ڈالنے والا آدمی اُن کبوتروں کا مالک تھا۔ وہ کبوتر باز تھا۔ کبوتروں کی پرواز پر وہ جوا کھیلتا تھا۔ اپنے کبوتروں میں ایک اجنبی کبوتر کو دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں چمک آگئی تھی۔ اپنے تجربے کی بنیاد پر اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ یہ کبوتر اچھی نسل کا ہے۔ اگر اس پر محنت کی جائے تو وہ بہت اُونچی پرواز کرے گا۔ اور سب سے آخر میں گھر لوٹ کر اُس کی جیت کا باعث بنے گا۔

وہ اب لالی کو پکڑنا چاہتا تھا۔ لالی ہر خطرے سے غافل پیٹ بھرنے میں لگا ہوا تھا۔ پاس ہی ایک برتن میں پانی رکھا ہوا تھا۔ پانی پینے کے بعد اُسے اپنے گھر واپس لوٹنا تھا۔ لیکن پھر چپکے سے قیامت چلی آئی۔ لالی کا سانس اُس کے سینے میں ہی پھنس کر رہ گیا تھا۔ اُس کا ننھا سا دل زور سے دھڑکا تھا۔ اور پھر اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ کسی نے اُسے دبوچ لیا تھا۔ اُس نے پوری قوت سے پھڑ پھڑانے کی کوشش کی لیکن گرفت بہت مضبوط تھی۔ اب اس گرفت سے نکلنا ناممکن تھا۔ وہ غلام ہو چکا تھا۔ کبوتر باز ایسے خوش ہو رہا تھا جیسے اُس کے ہاتھ کوئی خزانہ لگ گیا ہو۔

”پکڑ لیا...... پکڑ لیا......“

”کیا ہوا...... کسے پکڑ لیا؟“ نیچے سے اُس کی بیوی نے آواز لگائی۔

”بیگم ایک پردیسی کبوتر ہے۔ بہت ہی اچھا...... بہت ہی اعلیٰ...... آج تو قدرت ہم پر مہربان ہے......“

پھر وہ لالی سے مخاطب ہوا:

”اب تم پردیسی نہیں ہو...... یہ گھر تمہارا اپنا ہے۔“ اُس نے پنجرے کی طرف اشارہ کیا۔

”تھوڑی سی تکلیف تو تمہیں ہو گی۔ لیکن یہ ضروری ہے ورنہ تم اُڑ جاؤ گے۔ میں تمہارے پر نوچ لوں گا۔ اگلے دو ماہ میں تمہارے نئے پر آجائیں گے۔ اور تب تک تمہیں اپنے اس نئے گھر سے محبت ہو جائے گی۔ پھر آزاد ہونے کے باوجود بھی تم لوٹ کر اسی گھر میں آیا کرو گے۔ جیسے میرے دُوسرے کبوتر لوٹ آتے ہیں......“

پھر اُس نے مخصوص انداز میں لالی کو ایک ہاتھ میں پکڑا اور دُوسرے ہاتھ سے اُس کا بازو پھیلایا اور اپنے دانتوں کی مدد سے لالی کے پر نوچ لیے۔ لالی بہت تڑپا۔ اُسے بہت درد ہوا۔ چیخیں اُس کے گلے میں ہی گھٹ کر رہ گئیں۔ اب لالی پرواز کی صلاحیت کھو بیٹھا تھا۔ کبوتر باز نے لالی کو دُوسرے کبوتروں کے ساتھ چھوڑ دیا۔ لالی کے دونوں بازو لٹک گئے تھے۔ وہ ایک کونے میں سمٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اب ایک نئی دُنیا اُس کی منتظر

تھی۔ غلامی کی دُنیا...... لالی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

اس پنجرے میں رہنے والے غلام کبوتروں میں سے چند نے لالی کو خوش آمدید کہا۔ چند کو لالی کی آمد ناگوار گزری، لیکن چند دنوں میں ہی انہوں نے لالی کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا۔ لالی زیادہ تر خاموش رہتا تھا۔ وقت پر اُسے کھانا ملتا تھا۔ لیکن وہ بے دلی سے اتنا ہی کھاتا تھا کہ بس زندہ رہ سکے۔ اب اسے گزرا وقت یاد آتا تھا۔ آزاد فضاؤں میں پرواز کرنا۔ جب دل چاہے کھیتوں میں چلے جانا۔ دانہ دنکا چگ کر اپنے گھر لوٹنا۔ یہ مسرت اور خوشیوں بھری زندگی اب ماضی بن چکی تھی۔ اور جو حال تھا وہ غلامی کا دور تھا۔ اُس نے مستقبل کے حوالے سے اپنے دل میں منصوبہ بندی کر لی تھی۔ وہ اس نئے گھر میں دل نہیں لگائے گا۔ چاہے جتنا بھی وقت گزر جائے قوتِ پرواز آتے ہی وہ اڑ جائے گا۔ اور اپنے گھر، اپنے وطن میں آزادی کے ساتھ زندگی گزارے گا۔ اپنے ساتھی کبوتروں کے ساتھ اُس کا رویہ اجنبیوں والا ہی تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی کے لیے اُس کے دل میں محبت پیدا ہو۔ لیکن دو بچے ایسے تھے جنہوں نے لالی کے دل میں اپنے لیے جگہ بنالی تھی۔

یہ بھولو اور بالی تھے۔ دونوں پرلے درجے کے بھوکے اور ندیدے تھے۔ جب لالی قید ہوا تھا تو وہ ابھی پچیس دن کے تھے۔ وہ بول بول کر ہر وقت اپنے بھوکے ہونے کا اعلان کرتے رہتے تھے۔ کبوتر باز دن میں دوبار اپنے کبوتروں کو کھانا دیتا تھا۔ بھولو اور بالی کے ماں باپ اپنے پوٹو میں دانہ اور پانی بھر کر پنجرے میں جاتے تھے اور اپنے بچوں کو چوغا دیتے تھے۔ اس دوران دونوں بچے اُن پر حملہ کر دیتے تھے۔ ماں باپ گھبرا جاتے تھے۔ وہ اپنے بچوں کو تو پیٹ بھر کھلا دیتے تھے، لیکن خود بھوکے رہ جاتے تھے۔ کیونکہ تب تک دُوسرے کبوتر دانہ دنکا چٹ کر جاتے تھے۔ غلامی میں رہنے کی ایک سزا یہ بھی تھی ایک خاص حد سے زیادہ کبوتر باز انہیں خوراک

نہیں دیتا تھا۔ کبوتر باز سمجھتا تھا کہ زیادہ کھانے سے اُس کے کبوتر سست ہو جائیں گے۔ وقت گزر رہا تھا۔ بھولو اور بالی اب بڑے ہو گئے تھے۔ وہ لالی کے پکے دوست بن گئے تھے۔ لالی کے پر نکل آئے تھے۔ لیکن یہ پر ابھی کچے تھے۔ پروں کی جڑوں میں ابھی خون موجود تھا۔ آزادی کے حصول کے لیے لالی کو ابھی تھوڑا اور صبر کرنا تھا۔ لالی جب اداس ہوتا تھا تو بھولو اور بالی اُس کے پاس آجاتے تھے۔ پھر لالی انہیں اپنی کہانی سناتا تھا۔ جس میں اس کے گھر کا ذکر ہوتا تھا۔ آزاد فضاؤں کا ذکر تھا۔ کھیتوں، باغوں، چشموں اور میدانوں کا ذکر تھا۔

"میں لوٹ جاؤں گا، میں اپنے گھر لوٹ جاؤں گا، مجھے آزادی چاہیے...... آزادی......"

"ہمیں بھی اپنے ساتھ لے جائیں......"

ایک دن بھولی اور بالی نے لالی سے اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔ لالی نے چمکتی آنکھوں سے اُن کی طرف دیکھا۔ وہ غلامی میں بھی آزادی کی شمع روشن کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ یہ روشنی بھولو اور بالی نے دیکھ لی تھی۔

"ہمیں بھی اپنے ساتھ لے چلیں...... ہم آزادی کو دیکھنا چاہتے ہیں...... ہم آزاد فضاؤں میں زندگی گزارنا چاہتے ہیں......"

"آزادی کے راستے پر میں تم دونوں کو خوش آمدید کہتا ہوں......" لالی کی آواز میں جوش تھا۔

"لیکن ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا، آزادی حاصل کرنے سے زیادہ دُشوار آزادی کو برقرار رکھنا ہے، کیا تم اپنی آزادی کو برقرار رکھ سکو گے؟" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد لالی شرمندگی سے بولا:

"میں بھی اپنی آزادی کو برقرار نہیں رکھ پایا۔ کیوں کہ میں نے پیٹ سے سوچا تھا۔ سوچنے کا کام دماغ کا ہے اور دماغ کبھی دھوکا نہیں دیتا۔ ہم تب ہی غلام ہوتے ہیں۔ جب ہمارے دل میں لالچ آتا ہے۔ اور ہم پیٹ سے سوچنے لگتے ہیں اور پھر دانہ ڈالنے والا ہمیں غلام بنا لیتا ہے......"

بھولو اور بالی کچھ سوچنے لگے۔ پھر بھولو نے لالی سے کہا:

"ہم آپ کی اس نصیحت کو کبھی فراموش نہیں کریں گے۔ لیکن ایک بات بتائیے۔ ہم اس پنجرے میں غلام ہیں۔ لیکن ہمارا مالک ہمیں دو وقت کھانا دیتا ہے۔ ہمیں بھوکا نہیں مرنے دیتا۔ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ آزادی میں ہمیں دو وقت کا کھانا ملے گا......" بھولو کی اس بات پر لالی تڑپ اٹھا۔

"احمق...... یہ کمزور ایمان کی نشانی ہے۔ ہمارا مالک اللہ ہے اور اللہ اپنی مخلوق کو بھوکا اٹھاتا ضرور ہے لیکن بھوکا سلاتا نہیں ہے، کھانا ملے گا اور پیٹ بھر ملے گا۔ کھیتوں میں اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے کھانے کا وافر انتظام کر رکھا ہے......"

لالی درست کہہ رہا تھا۔ عظیم صوفی شاعر حضرت بابا بلھے شاہؒ کے چند پنجابی اشعار کا مطلب کچھ یوں ہے کہ پرندے اپنے لیے خوراک ذخیرہ نہیں کرتے صبح گھر سے بھوکے نکلتے ہیں اور پیٹ بھر کر واپس لوٹتے ہیں کبھی کسی نے کسی پرندے کو بھوک سے مرتے دیکھا ہے۔ لیکن انسان خوراک ذخیرہ کرتا ہے پھر بھی بھوکا مرتا ہے۔

لالی کو قید میں دو ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اب اُس کے پروں میں اتنی طاقت آگئی تھی کہ وہ طویل پرواز کر سکے۔ آزادی کے حصول کے لیے اس پرواز میں بھولو اور بالی بھی شامل تھے۔ یہ پنجرے میں اُن کی آخری رات تھی۔ اگلی صبح کبوتر باز اپنے کبوتروں کو دانہ ڈالنے کے لیے چھت پر آیا۔ کبوتر بھوک کی وجہ سے پنجرے کی جالیوں سے ٹکرا رہے تھے۔ کبوتر باز نے چھت پر دانہ پھینکا اور پنجرے کا دروازہ کھول دیا۔ کبوتر دانے پر ٹوٹ پڑے۔ ایسے میں لالی بجلی کی سی تیزی سے باہر نکلا اور اڑ گیا۔ اُس کے پیچھے بھولو اور بالی بھی تھے۔ دانہ دیکھ کر ایک لمحے کے لیے اُن کا ارادہ کمزور پڑ گیا۔ پھر انہیں لالی کی یہ بات یاد آگئی۔

"آزادی کے حصول سے زیادہ دشوار آزادی کو برقرار رکھنا ہے۔ اگر پیٹ سے سوچو گے تو کبھی آزادی حاصل نہیں کر پاؤ گے۔"

بھولو اور بالی بھی لالی کے پیچھے پرواز کر گئے۔ کبوتر باز چیختا ہی رہ گیا۔ وہ اس قابل نہیں تھا کہ اڑ کر تینوں کبوتروں

کو پکڑ لے۔ ہوا کیا تھا، یہ بات کبوتر باز کی سمجھ سے باہر تھی۔ وہ تینوں آن کی آن میں بلند فضاؤں میں پہنچ گئے۔ لالی اپنے گھر کی طرف جانے والا راستہ ڈھونڈ رہا تھا۔ پھر اُسے راستے کی سمجھ آ گئی۔ اب وہ تینوں اسی سمت میں پرواز کر رہے تھے۔ خوشیوں اور مسرتوں بھری نئی زندگی ان کی منتظر تھی۔ اور گھر میں لالی کے والدین اور بہن بھی لالی کے لوٹنے کا انتظار کر رہے تھے اور اب انتظار ختم ہو رہا تھا۔ یہ آزاد کبوتروں کا ایک چھوٹا سا قبیلہ بن گیا تھا۔ ہر دن عید کا دن تھا اور ہر رات شبِ برات تھی۔ پھر کتنے ہی دن گزر گئے۔ بھولو اور بالی کے دل میں آزادی کے حوالے سے جو غلط فہمیاں تھیں وہ دُور ہو گئی تھیں۔ اب وہ خوش تھے کہ انہوں نے اچھا فیصلہ کیا تھا۔

موسم بدل رہا تھا۔ ایک دن آندھی چلی کالے بادلوں نے آسمان کو گھیر لیا۔ بارش مسلسل تین دنوں تک برستی رہی۔ آزاد کبوتروں کا یہ غول اپنے گھر میں محصور ہو کر رہ گیا۔ اب صرف پانی پر گزارا تھا۔ لالی اور اُس کے اہل خانہ اس بدلتی موسمی صورت حال کے عادی تھے۔ لیکن بھولو اور بالی کے لیے یہ معاملہ تکلیف دہ تھا۔ انہیں بھوک تڑپا رہی تھی۔ تیسری رات بادل پھٹ گئے۔ آسمان پر ستارے ٹم ٹمانے لگے تو لالی خوش ہو کر بولا:

''بس ایک رات کا انتظار اور ہے، صبح ہمیں ہمارے نصیب کا رزق ضرور ملے گا......''

پھر نئے دن کا آغاز ہوا۔ سب مختلف سمتوں میں رزق کی تلاش میں روانہ ہو گئے۔ بھولو، بالی اور لالی ہمیشہ ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ وہ تینوں ایک کھیت میں موجود درخت پر آ بیٹھے تھے۔ ایسے میں بھولو خوشی سے بولا:

''وہ دیکھو...... خوراک......'' لالی اور بالی نے دیکھا۔ ایک جگہ پر دانہ بکھرا ہوا تھا۔ یہ دانہ گندم چنے اور باجرے پر مشتمل تھا۔ بالی اور بھولو اپنے پر سمیٹنے لگے۔ وہ خوراک پر حملہ کرنا چاہتے تھے۔ ایسے میں لالی بول پڑا:

''احمقو! تم پیٹ سے سوچ رہے ہو۔ ذرا غور کرو۔ سارا دانہ ایک مخصوص جگہ پر موجود ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی شکاری نے جال بچھا رکھا ہو۔''

''ہم احمق نہیں ہیں، حماقت والی باتیں تو آپ کر رہے ہیں یہاں ہمیں کوئی جال نظر نہیں آ رہا۔''

بھولو اور بالی فضا میں بلند ہوئے۔

''رک جاؤ...... غلامی کے بعد دوبارہ آزادی کے لیے طویل انتظار کرنا پڑتا ہے۔ میری بات مان لو، رک جاؤ۔''

لالی شور مچاتا ہی رہ گیا۔ بھولو اور بالی نے دانے پر حملہ کر دیا تھا۔ ان کے پیٹ کی آگ بجھ رہی تھی اور سکون مل رہا تھا۔ دل ہی دل میں وہ خوش ہو رہے تھے کہ لالی ہمیں فضول میں ڈرا رہا تھا۔ یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اچھی طرح پیٹ بھرنے کے بعد انہوں نے پرواز کرنے کے لیے پر پھیلائے۔ انہیں یوں محسوس ہوا کہ جیسے زمین نے اُن کے قدموں کو پکڑ لیا ہو۔ وہ گھبرا گئے۔ پرواز کے لیے وہ پھڑپھڑانے لگے۔ لیکن وہ جتنا زور لگاتے تھے۔ اتنا ہی پھنستے چلے جاتے تھے۔ وہ شکاری کے بچھائے جال میں قید ہو چکے تھے۔ لالی اُن کے اُوپر آزاد فضاؤں میں پرواز کر رہا تھا۔ وہ اپنے دوستوں کی مدد کرنے کے قابل نہیں تھا۔ لیکن اُس کا دل رنجیدہ تھا۔ اتنے میں انہیں دُور سے شکاری آتا دکھائی دیا۔ اُس کے ہاتھ میں پنجرہ موجود تھا۔

''میں نے کہا تھا جو پیٹ سے سوچتے ہیں غلامی اُن کا مقدر بن جاتی ہے۔ افسوس تم لوگوں نے آزادی تو حاصل کر لی لیکن اُسے برقرار نہیں رکھ پائے......''

لالی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ شکاری نے جال کے قریب پہنچ کر بھولو اور بالی کو پکڑ کر پنجرے میں قید کر لیا۔ وہ دونوں بھی رو رہے تھے۔ لالی نے آواز لگائی:

''میں تمہارا انتظار کروں گا......''

لالی جانتا تھا۔ بھولو اور بالی آزادی کی قدر کو جان چکے ہیں۔ چاہے جتنا بھی وقت لگ جائے۔ قوتِ پرواز آتے ہی وہ آزادی کے حصول کے لیے کوشش کریں گے۔ اور پھر واپس لوٹ آئیں گے۔ غلامی سے آزادی اور آزادی سے غلامی تک کا یہ سفر ان دونوں کو یہ شعور ضرور دے گیا کہ پیٹ سے سوچنے والوں کا مقدر غلامی ہے۔ صرف اور صرف غلامی۔☆

رحمتوں اور برکتوں کا مہینہ

رمضان المبارک

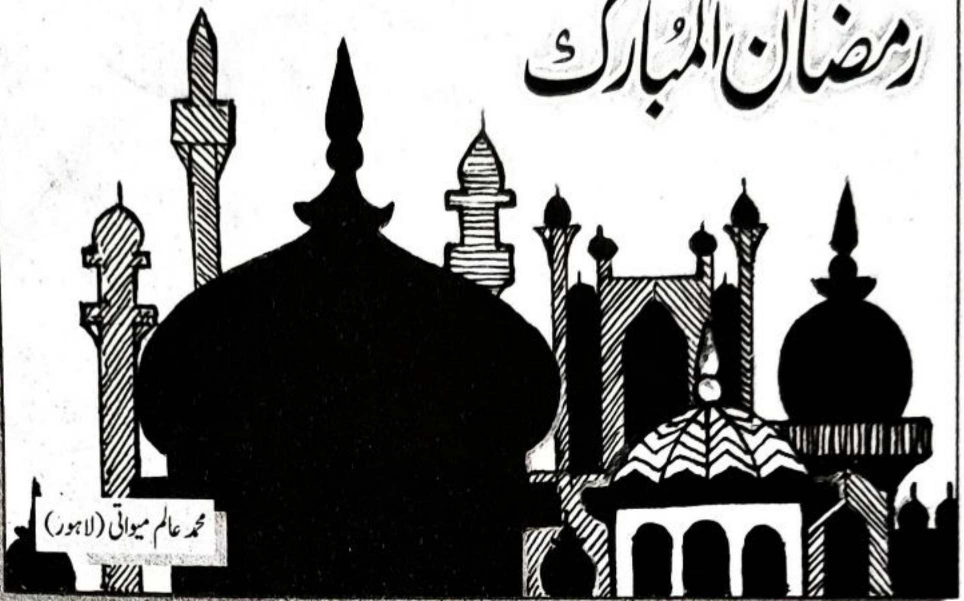

محمد عالم میواتی (لاہور)

رمضان المبارک کا مہینہ رحمتوں اور برکتوں کا مہینہ ہے۔ روزے کو عربی میں صوم یا صیام کہتے ہیں جس کے معنی کسی چیز سے رُک جانا کے ہیں۔ رمضان کے روزے ہر عاقل اور بالغ مسلمان پر فرض ہیں۔ روزے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

"اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے، جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے تاکہ تم پرہیز گار بن جاؤ۔" (سورۂ بقرہ آیت 183)

رمضان کے مبارک مہینے میں اللہ تعالیٰ کی رحمت و محبت عروج پر ہوتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ یہ ایسا بابرکت مہینہ ہے کہ اِس کا اوّل حصہ (یعنی پہلے دس دن) اللہ کی رحمت ہے۔ اِس کا درمیانی حصّہ گناہوں سے معافی ہے۔ اور آخر حصہ (جہنم کی) آگ سے آزادی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ روزہ داروں کو چاہیے کہ وہ بڑی کثرت سے کلمہ طیبہ پڑھا کریں اور اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگا کریں۔

حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اُس کے فرشتے (اللہ کے حکم سے) سحری کھانے والوں پر رحمت نازل کرتے اور اُن کو دُعا دیتے ہیں۔ جب کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی صحابی کو سحری کھانے کی دعوت دیتے تو اِرشاد فرماتے: "آؤ، برکت کا کھانا کھالو۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم روزہ کھولنے کے وقت یہ دُعا مانگا کرتے تھے: "اے اللہ! تیرے ہی لیے روزہ رکھا۔ تجھی پر میرا ایمان ہے، تیرے ہی وعدے پر میرا پورا بھروسا ہے اور میں تیرے ہی رزق میں سے کھا کر روزہ افطار کرتا ہوں۔"

جو انسان روزہ رکھ کر جھوٹ بولے، بُرے کام کرے، اپنے ہاتھ سے کسی کو اذیت دے اور خود کو گناہ سے نہ بچائے تو اُسے روزہ رکھ کر کچھ بھی نہیں ملے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"کتنے ہی روزے دار ایسے ہیں کہ روزے سے بھوک اور پیاس کے سوا اُن کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔"

رمضان المبارک کی آخری دس راتوں میں ایک رات ایسی آتی ہے جسے لیلۃ القدر یا شبِ قدر کہتے ہیں۔ یہ رات اتنی برکتوں والی ہے کہ اِس کی شان میں قرآن مجید میں ایک سورت نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اس سورت میں ارشاد فرماتا ہے:

"ہم نے اس (قرآن) کو شبِ قدر میں نازل کیا ہے۔ آپ کو کچھ معلوم بھی ہے کہ شبِ قدر کتنی بڑی چیز ہے۔ شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔"

اِسی مبارک رات کو پاک وطن کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اس مقدس رات کو ملنے والے اِس انمول تحفے کی اللہ تعالیٰ ہمیں حفاظت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ شبِ قدر کو رمضان کی اکیس، تیئس، پچیس، ستائیس یا انتیسویں رات میں تلاش کرو۔

رمضان المبارک کا ہر لمحہ رحمت ہی رحمت ہے۔ دن کو روزہ اور رات کو تراویح پڑھنے سے روزہ دار کو اللہ تعالیٰ کی خوش نودی حاصل ہوتی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اس بابرکت مہینے کے ہر لمحے سے بھرپور فائدہ اٹھائیں۔

مقابلۂ معلوماتِ عامہ، تقریری مقابلہ، مباحثہ یا ملی نغموں کے مقابلے دورِ طالب علمی میں ہر اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی جانب سے بچوں میں مقابلے کا رجحان پیدا کرتے ہیں۔ یہ طالب علموں میں چھپی صلاحیتوں کو سامنے لا کر غیر نصابی سرگرمیوں کو پروان چڑھاتے ہیں۔ یقیناً آپ کے اسکول اور کالج میں بھی اس قسم کے مقابلے ہوتے ہوں گے۔ اگر آپ ان میں حصہ نہیں لیتے تو ضرور لیجیے تاکہ ان مقابلوں سے آپ کے اندر جستجو اور کچھ کر گزرنے کا حوصلہ پیدا ہو۔ آج ہم آپ کو ایسے مقابلوں کی تیاری سے متعلق معلومات دے رہے ہیں تاکہ آپ بھی آئندہ ایسے پروگراموں میں حصہ لینے کے لیے خود کو تیار کر سکیں۔

عموماً معلوماتِ عامہ کا شغف آپ کو تا حیات کام یابی سے ہم کنار رکھتا ہے اور اس سے مسلسل علم کا شوق بھی برقرار رہتا ہے۔ ہم اپنے اِردگرد وقوع پذیر ہونے والے واقعات سے خود کو باخبر رکھ کر نہ صرف اپنے مستقبل کا لائحہ عمل طے کر سکتے ہیں بلکہ یہ ہمارے حال کے لیے بھی سود مند رہتا ہے۔ حالاتِ حاضرہ اور ماضی کے بارے میں جاننے کا عمل ہی ہمیں ماضی، حال اور مستقبل کی مضبوط ڈوری میں باندھے رکھتا ہے۔ جہاں مسلسل محنت اور جدوجہد سے کام یابی کا دروازہ کھلتا ہے۔ معلوماتی کتب اور اخبار کے مطالعے کے ساتھ ساتھ سیکھنے کا عمل ہمارے اس شوق میں بے حد معاون ثابت ہوتا ہے۔ اگر آپ بھی معلوماتِ عامہ یا کسی اور موضوع پر منعقد ہونے والے کوئز مقابلے میں شرکت کرنا چاہتے ہیں تو آپ مستند انسائیکلوپیڈیاز سے نوٹس بنائیے، اخبارات اور رسائل میں شائع ہونے والے مطلوبہ موضوع پر مواد اکٹھا کر کے مطالعہ کیجیے اور وہاں مارکیٹ میں موجود ڈھیروں کوئز بکس میں سے صرف معیاری اور اغلاط سے پاک کتب کا انتخاب کر کے مطالعہ بڑھائیے۔ کتب کے انتخابات میں اپنے اساتذہ، بزرگوں اور دوستوں سے مدد لیجیے۔ آپ اخبار بینی کی عادت ڈال لیجیے۔ اس سے آپ کے علم میں اضافہ اور مطالعہ کی عادت پختہ ہو گی۔

ہم اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے الفاظ کا سہارا لے کر جب سامنے موجود مخاطب کو قائل کرتے ہیں تو یہ تقریر کہلاتی ہے۔ عموماً کسی خاص موضوع پر سامعین یا حاضرین کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کرنا تقریر کہلاتا ہے۔ آپ بھی ایسے مقابلے کے لیے خود کو تیار کریں اور جب کسی موضوع پر تقریر کرنا مقصود ہو تو کتابوں اور اساتذہ سے مدد لے کر اس موضوع پر بھرپور مواد تیار کریں اور پھر مکمل اعتماد کے ساتھ اس موضوع پر تقریر کر کے خود کو منوائیں۔ یاد رکھیے اس فن میں طاق ہونے کے لیے آپ کا بھرپور مطالعہ اور موضوع پر گرفت آپ کا پہلا موثر ہتھیار ہے۔ اس کے بعد زبان و بیان پر عبور اور اندازِ بیان کا نمبر آتا ہے۔ شروع میں اگر آپ ناکام ہوں تو گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ناکامی ہی سے تو انسان کام یابی کی جانب بڑھتا ہے۔ کسی دانش ور نے تقریر کے فن میں کمال

حاصل کرنے کا یہ ہنر بتایا ہے کہ آپ تقریر کرتے وقت یہ تصور کرلیں کہ جو آپ کو معلوم ہے وہ آپ کے سامنے موجود حاضرین کو معلوم نہیں اور آپ انہیں بتانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ نسخہ آپ کے اندر چھپے خوف اور گھبراہٹ کو آہستہ آہستہ ختم کر دے گا۔

یہی حال مباحثے میں حصہ لینے کا ہے۔ مباحثے میں آپ کو دیئے گئے موضوع پر موافقت یا مخالفت میں اپنا موقف پیش کرنا ہوتا ہے۔

یومِ پاکستان (23 مارچ) یومِ آزادی (14 اگست) اور یومِ دفاع (6 ستمبر) سمیت دیگر اہم قومی دنوں پر تعلیمی اداروں اور مختلف ادبی تنظیموں کے زیرِ اہتمام طلبہ وطالبات کے مابین ملی نغمات کا مقابلہ ہوتا ہے۔ آپ بھی اپنے ذوق، اچھی آواز اور وطن سے محبت کا اظہار ملی نغموں کے ذریعے کرتے ہوں گے تو پھر خود کو اِن مقابلوں کے لیے تیار کرنا اور بھی فائدہ مند ہو گا۔ مسلسل محنت اور مشق سے ہی کامیابی کا دروازہ کھلتا ہے۔ وطن سے محبت کا اظہار ان ملی نغموں کے مقابلوں سے کیجیے تاکہ آئندہ کی عملی زندگی میں یہ محبت مزید بڑھے اور آپ اچھے پاکستانی بن کر ملک وقوم کی خدمت کر سکیں۔

اسی طرح مصوری کے مقابلے بھی ہوتے ہیں۔ آپ یہاں بھی خود کو مصروف رکھ کر اپنے شوق کی تسکین پا سکتے ہیں۔ مختلف اخبارات اور رسائل کے ساتھ ساتھ تعلیم وتربیت میں بھی آپ کو ہر ماہ ایک دیئے گئے موضوع پر مصوری کے مقابلے کی دعوت دی جاتی ہے۔ ان مقابلوں میں حصہ لے کر آپ اپنے شوق کی تکمیل کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں اساتذہ یا اپنے گھر کے بڑوں سے مدد ضرور لیجیے تاکہ آپ کی غلطیاں اور خامیاں دُور ہو سکیں۔ ان غلطیوں کو دُور کر کے اور مسلسل شوق ہی سے آپ ایک اچھے مصور بن سکتے ہیں۔

ان مقابلوں میں حصہ لینے کے لیے پہلی شرط آپ کا

ارادہ اور حوصلہ ہے اس کے بعد ہی تمام مراحل آتے ہیں۔

خطوط لکھنا بھی ایک فن ہے۔ آج کے ایس ایم ایس کے دور میں بھی خط لکھنے کی اہمیت کسی طور پر بھی کم نہیں ہوئی۔ محکمہ ڈاک خاص مواقع پر خطوط نگاری کا مقابلہ کرواتا ہے۔ آپ اساتذہ یا مختلف رسائل کے مدیران کو بھی خط لکھتے ہوں گے...... یہ بھی ایک فن ہے کہ آپ کم سے کم الفاظ اور خوب صورت جملوں میں اپنی بات خط پڑھنے والے تک پہنچائیں۔ یاد رکھیے خوب صورت الفاظ کا انتخاب ہی آپ کی شخصیت کے بارے میں پتہ دیتا ہے۔ مرزا غالب شاعر ہونے کے علاوہ اپنے خطوط کے حوالے سے بھی مشہور ہیں۔ اگر آپ خود کو اس شوق میں مصروف رکھنا چاہتے ہیں تو خطوطِ غالب کے علاوہ کئی ادیبوں اور معروف لوگوں کے خطوط جو کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں، ان کا مطالعہ کیجیے۔ اس سے آپ کی تحریر میں ایک اچھی نثر کا حسن بھی پیدا ہو جائے گا۔

---☆☆---

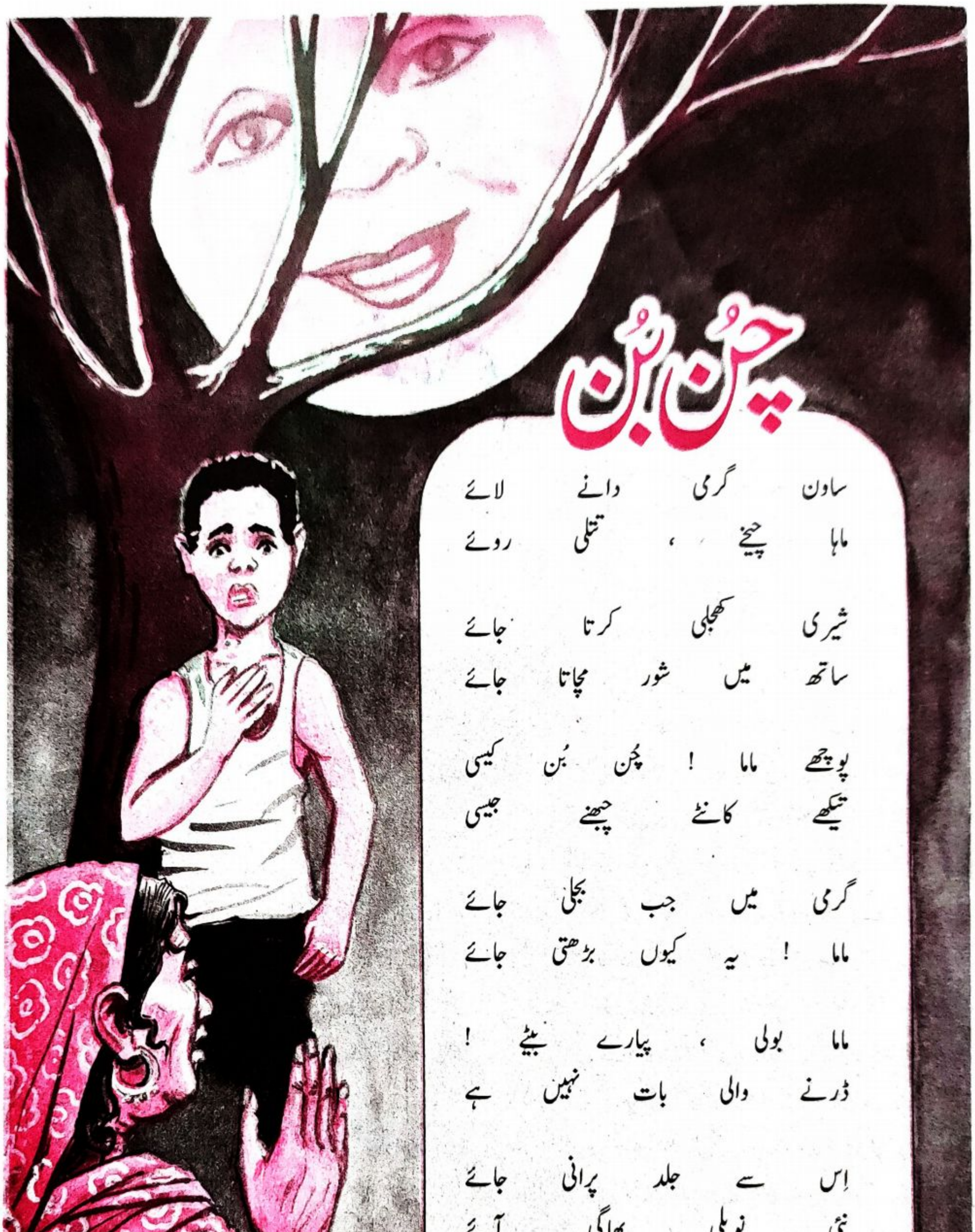

چُن بُن

ساون گرمی دانے لائے
ماہا چیخے ، تتلی روئے

شیری کھجلی کرتا جائے
ساتھ میں شور مچاتا جائے

پوچھے ماما ! چُن بُن کیسی
تیکھے کانٹے چبھنے جیسی

گرمی میں جب بجلی جائے
ماما ! یہ کیوں بڑھتی جائے

ماما بولی ، پیارے بیٹے !
ڈرنے والی بات نہیں ہے

اِس سے جلد پرانی جائے
نئی نویلی بھاگی آئے

یہ گرمی کا تحفہ ہے نا !
ہر ساون میں ملتا ہے نا !

ناصر ملک، لیہ

روشنِ دِل

محمد فاروق دانش (حیدر آباد)

"صاب...... ام...... آپ......" چوکی دار نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ ارسلان صاحب کے فون کی گھنٹی بج گئی۔

"ہیلو! ہاں،...... ہاں......"

ارسلان صاحب نے بات چیت شروع کر دی۔ ابھی انہوں نے فون رکھ کر چوکی دار کی طرف توجہ کی ہی تھی کہ اُن کے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔

"جی سر...... جی...... جی آپ بے فکر رہیں سر! اس بار ہمارا بینک یومِ آزادی پر وہ چراغاں کرے گا کہ بس......"

وہ بہت جوش سے بات کر رہے تھے۔

"میں نے سب کچھ سوچ لیا ہے۔ جی جی...... میں ابھی اپنے معاون سے بات کر کے آپ کو تفصیل سے آگاہ کروں گا، اوکے سر......"

مینجر صاحب نے کرسی گھمائی۔ پھر انہیں چوکی دار اپنے سامنے کھڑا نظر آیا۔

"وہ صا......ب......" ابھی اُس کے منہ سے یہی الفاظ ادا ہوئے تھے کہ ارسلان صاحب کو اپنا کام یاد آگیا۔

"کامران صاب کو اندر بھیجو۔"

"وہ......" اس نے پہلے اپنی بات کرنے کی کوشش کی لیکن افسر کا موڈ دیکھ کر نہ سکا۔

"ابھی بھیجتا ہوں صاب!"

اُس کی کرب زدہ آواز سنائی دی۔ وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور کامران صاحب اندر داخل ہوئے۔

"ارے آیئے کامران صاحب...... کہاں ہیں آپ......؟" انہوں نے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔

"میں تو یہیں ہوں سر، دراصل وہ......"

"یومِ آزادی بالکل سر پر آپہنچا ہے، میں نے آپ کے ذمے کوئی کام لگایا تھا۔" انہوں نے یاد دلاتے ہوئے کہا۔

"مجھے یاد ہے سر!" ہمیں اپنے اس بینک کو خوب روشن کرنا ہے۔" وہ بولے۔

"برقی قمقمے، ٹیوب لائٹیں، جگمگاتی راڈز اور جھنڈیاں خوب اچھی طرح لگنی چاہیں۔" وہ خوشی بھرے لہجے میں بولے۔

"ضرور ضرور...... بل کہ سر، میں نے بجلی والے کو بھی بلایا ہے، وہ باہر انتظار کر رہا ہے۔" کامران صاحب نے بھی اسی جوش کے ساتھ جواب دیا۔

"تو پھر بلایئے نا اُسے۔" وہ بھی اس کام کو فوری کرنے کے درپے تھے۔

"ابھی لایا سر۔" کامران صاحب نے کہا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔ چند ساعتوں کے بعد وہ ایک الیکٹریشن کے ہم راہ داخل ہوئے۔

"سلام صاحب!"

آنے والے نے اپنے ماتھے پر ہاتھ ٹکایا اور زور دار آواز میں بولا۔ اُس نے اپنے ایک کاندھے پر میلا سا تھیلا لٹکا رکھا تھا اور دُوسرے ہاتھ میں پلاس تھا۔ جیب کا ایک کونا سلائی ادھڑنے کے باعث لٹک رہا تھا۔ اُس میں ایک ٹیسٹر لگا ہوا تھا۔

"ہاں آگئے تم؟"

"جی صاحب۔"

"تمہیں معلوم ہے بینک کی اس پوری بلڈنگ کو بقعۂ نور بنانا ہے۔"

"ہاں صاحب جی! 14اگست آرہا ہے، اس پر تو لائیٹنگ ضروری ہے جی!" وہ اپنے دانتوں کی نمائش کرتا ہوا بولا۔

"اندازہ لگایا تم نے کچھ حساب کتاب کا؟" انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"جی میں ساری چھت دیکھ آیا ہوں۔ کوئی چار سو جھالریں لٹکانا پڑیں گی۔"

"کوئی پروا نہیں لٹکا دینا۔ پانچ سو لگیں تو وہ بھی لگا دینا۔" پاکستان کا جشن منانے کے لیے وہ شدید بے تاب تھے۔

"میں نے سوچا ہے صاحب جی!" اُس نے اپنے مال بنانے کے منصوبے پر عمل شروع کر دیا۔ "چھت پر ہی بانسوں کا خوبصورت سا ڈیزائن بنا کر اس پر رنگ برنگی ٹیوب لائیٹس لگاؤں گا۔ اس سے آپ کا بینک بہت خوب صورت نظر آئے گا صاحب۔" وہ ایک بار پھر خوف ناک ہنسی ہنسا۔

"اور نیچے کی عمارت کے لیے کیا سوچا ہے تم نے؟" اب کی بار کامران صاحب بولے۔

"اجی سوچنا کیا ہے،" پورا پلان ہے میرے اس دماغ میں۔" اس نے بے ساختہ کہا۔ "ایسا لاجواب کام کروں گا کہ آپ خوش ہو جائیں گے۔"

"کتنی رقم کا اندازہ لگایا ہے اس تمام کام کا......؟" ارسلان صاحب نے سوال کیا۔

"اجی صاحب! بنتے تو کوئی چوبیس ہزار روپے ہیں لیکن کامران صاحب سے پرانی واقفیت نکل آئی ہے اس لیے میں صرف بیس ہزار روپے لوں گا اس کام کے۔"

"کچھ زیادہ نہیں ہیں بیس ہزار روپے؟" کامران صاحب چونک کر بولے۔

"ہاں یار! کچھ رعایت ہونی چاہیے اس بڑے کام میں۔" کامران صاحب کو بولتا دیکھ کر ارسلان صاحب نے ہمت پکڑی اور بول اٹھے:

"دیکھو بھئی! اس کام کے تمہیں پندرہ ہزار روپے سے زیادہ نہیں دیں گے ہم۔" کامران صاحب نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

"کیا کہہ رہے ہیں صاحب، یہ تو بہت کم رہیں گے، یہ تو لائٹوں کا کرایہ بھی نہیں۔ پھر ہماری مزدوری کس طرح نکلے گی۔"

اس نے پلاس میز سے اٹھایا اور تھیلے کو اس طرح سیٹ کرنے لگا جیسے واپس جانے کی تیاری کر رہا ہو۔

"مجھے افسوس ہے کامران صاحب۔ بس آپ کی خاطر انیس ہزار روپے کر سکتا ہوں ورنہ جیسے آپ کی مرضی۔"

اُس نے قدم آگے بڑھائے تو ارسلان صاحب اچانک بول پڑے۔

"دیکھو بھئی، اٹھارہ ہزار روپے لو تو کام کر دینا ورنہ ہم کسی اور کو دکھا دیں گے۔"

اگر ساڑھے اٹھارہ کر دیتے تو...... چلیں ٹھیک ہے، میں کل ہی کام شروع کر دوں گا۔" وہ انتہائی خوش دلی سے بولا۔

اس کے جانے کے بعد ارسلان صاحب نے کامران صاحب کی طرف ایسی نظر سے دیکھا جیسے سوال کر رہے ہوں کہ میں نے ریٹ درست طے کیا ہے یا کہ نہیں۔ کامران صاحب نے بھی آنکھوں کو گھماتے ہوئے یہ تاثر دیا کہ آپ نے بالکل درست ریٹ طے کیا ہے، اس پر ارسلان صاحب خوش ہو گئے اور ایک فائل کھول کر اُس کی ورق گردانی کرنے لگے جب کہ کامران صاحب اپنی سیٹ کی جانب چل دیے۔

اگلی صبح الیکٹریشن آگیا۔ وہ دو تین کاغذوں پر برقی قمقموں کی آرائش کا خاکہ بنا کر لایا تھا۔ کامران صاحب بھی ساتھ تھے

ارسلان صاحب اور وہ اس ڈیزائن کا جائزہ لیتے رہے۔ آرائش کی سیٹنگ بہت اچھی کی گئی تھی۔ ارسلان صاحب دل ہی دل میں اس کی تعریف کر رہے تھے۔

"باقی تو سب ٹھیک ہے۔" وہ اس سے گویا ہوئے۔ "لیکن دیکھو! یہ تم نے کلر فل ٹیوب لائٹوں کا جو چکر دار گھیرا داہنی ہاتھ والی سمت لگانا چاہا ہے۔ وہ درست نہیں۔"

"کیوں سر......!' اس طرف سے روشنی ہمارے گیٹ کے سامنے بھی پڑے گی۔" کامران صاحب کو غالباً ارسلان صاحب کا اعتراض درست معلوم نہ ہوا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ اگر یہ چکردار گھیرا بائیں سمت لگا دیا جائے تو اس طرف سامنے کی جانب چوراہا ہے، ہر آنے جانے والے کی نظر بے اختیار عمارت کی جانب اٹھ جائے گی اور دیکھنے والا ہماری سجاوٹ دیکھ کر دنگ رہ جائے گا۔"

"آپ نے بالکل درست فرمایا، میرا دھیان اس جانب بالکل نہیں کیا تھا۔"

الیکٹریشن نے اپنی غلطی کو تسلیم کرتے ہوئے کہا۔ وہ دراصل مین گیٹ پر دھیان دے رہا تھا جب کہ وہ دُوسرے زاویے سے سوچ رہے تھے۔

"ٹھیک ہے جی! کوئی مسئلہ نہیں، اس کو اس جانب لگا دیتے ہیں۔" اُس نے ڈیزائن پر لکیر پھیرتے ہوئے کہا۔

"سر! آپ نے بہت اچھی بات سمجھائی ہے۔"

اب کی بار کامران صاحب نے بھی ان کے موقف کو سمجھتے ہوئے اُن کی ہم نوائی کی۔

"صاحب بلڈنگ کی بہتر سجاوٹ پر حکومت انعام بھی تو دیتی ہے؟" اس نے اپنے پیلے پیلے دانتوں کو نکال کر عجیب سا سوال کیا، گویا اگر انعام مل جائے تو اُسے بھی کچھ دیا جائے۔

"ہاں! ہر شہر میں سب سے بہتر چراغاں پر حکومت ایک عمارت کے لیے کچھ انعام کا اعلان تو کرتی ہے۔"

"آپ بے فکر رہیں صاحب! میں آپ کے بینک کو ایسا روشن کروں گا کہ اس عمارت کو انعام تو ملے ہی ملے۔"

اس نے جھومنے والے انداز میں بے حد خوشی کے ساتھ کہا۔ ایک لمحے کو ارسلان صاحب بھی انعام کا ذکر سن کر خوش ہو گئے، وہ بھی چاہتے تھے کہ کسی طرح ان کے بینک کی نیک نامی ہو۔

الیکٹریشن 13 اگست کی دوپہر آنے کا کہہ کر چل دیا۔ وہ

دوپہر سے شام تک اپنی کارروائی مکمل کرنے والا تھا۔ یوں 13اگست کی شام عمارت جگمگانے لگے گی اور 14اگست کی شام اس عمارت کی انوکھی منفرد شام ہو گی۔

"سر! ہمیں ہیڈ آفس کی جانب سے پچیس ہزار روپے اس جشن کو منانے کے لیے دیے گئے ہیں۔" کامران صاحب نے جیسے ارسلان صاحب کو یاد دلاتے ہوئے کہا۔ "اور ہمارا کام تو اٹھارہ ہزار میں ہی بن گیا ہے۔"

"ارے نہیں بھئی کامران صاحب! آپ ایک بات بھول رہے ہیں۔ 14اگست کی صبح ہمارے یہاں پرچم کشائی کی تقریب بھی تو ہے۔"

"جی سر!"

"اس میں ہم نے ڈی سی او اور دیگر کئی معززین کو بطورِ مہمان بلوایا ہے، میں نے رشید صاحب کے ذمے کھانے پینے کا کام لگایا ہے، باقی رقم سے ہم ایک شان دار دعوت کریں گے۔ ہمیں کون سے سرکار کے پیسے بچانے ہیں یا جیب میں ڈالنے ہیں۔" وہ مسکرا کر بولے۔

"وہ...... سر...... میں حاضر ہو سکتا ہوں۔" دروازے پر چوکی دار شبیر خان موجود تھا۔ ارسلان صاحب نے اُسے دیکھ کر مسکرا کر کہا:

"آؤ بھئی آجاؤ۔"

"صاحب وہ......" اُس نے کامران صاحب کی جانب دیکھا اور کچھ بولنے سے ہچکچایا۔

"کیا بات ہے تم دو تین دنوں سے چکر لگا رہے ہو؟" انہیں کچھ یاد آگیا تھا۔

"وہ دراصل...... سر جی، بات یہ ہے کہ...... مجھے کچھ رقم...... ایڈوانس چاہیے تھی۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"...... ارسلان صاحب کے تیور اچانک بدل گئے۔ ان کا مسکراتا چہرا غصے سے لال ہو گیا۔ "تم لوگوں سے ذرا ہنس کر بات کر لو تو تم رقم مانگنے لگ جاتے ہو۔ اس بینک میں کیا صرف ایڈوانس کے لین دین کا ہی کام ہوتا رہے گا۔" وہ رقم کے تقاضے کا سن کر پریشان ہو گئے تھے، صبح بھی ایک ہیڈ کلرک دس ہزار روپے ایڈوانس کی درخواست لے کر آیا تھا۔ دو روز قبل وہ آفس سپرنٹنڈنٹ کو پانچ ہزار روپے گرانٹ کر چکے تھے، اب یہ چوکی دار اسی سلسلے میں چلا آیا تھا۔

"صاحب! ام کو رقم مانگنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔" وہ عاجزی سے بولا۔

"شوق کسے ہوتا ہے یہ تو عادت ہوتی ہے عادت۔"

"تمہیں کس لیے چاہیے تھی رقم؟" کامران صاحب نے معاملے کو نارمل کرنے کے لئے لقمہ دیا۔

"امارے (ہمارے) گھر کا بجلی کا بل تین ہزار روپے کا آگیا صاب! ہم ادا نہیں کر سکا تو ہمارا بجلی کٹ گیا، تین روز سے ام اندھیرے میں بیٹھا ہے۔" وہ پریشان کن لہجے میں بولا۔ "ہم نے دفتر کے چکر کاٹ کر کوشش کیا صاب۔"

"وہاں سے قسطیں کروا لیتے؟" ارسلان صاحب نے مشورہ دیا۔

"وہ قسط پندرہ سو کا کرتا ہے صاب! مارا (ہمارا) بچہ لوگ گرمی میں بغیر روشنی اور بغیر پنکھے کے پڑا ہے۔"

"اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں ہے، بجلی تم استعمال کرتے ہو بل بھی تم ہی کو ادا کرنا ہے، ہم نے تو کوئی ٹھیکہ نہیں لے رکھا۔" ارسلان صاحب دفتری معاملات میں سخت گیر تھے انہیں اندازہ تھا کہ زیادہ نرمی سے ملازمین سر چڑھ جاتے ہیں اس لیے وہ اس طرح کا رویہ روا رکھتے تھے۔

"دیکھیں سر!" کامران صاحب نے انہیں کچھ سمجھانے کی کوشش کی۔

"آپ رہنے دیں کامران صاحب!" وہ غصے سے بولے۔ "میں ان لوگوں کی عادت خوب اچھی طرح جانتا ہوں، یہ لوگ کوئی حیلہ بہانہ کر کے صرف ادھار کے چکر میں رہتے ہیں۔"

"مگر سر!......اس کی لائٹ......"

"جھوٹ بولتا ہے یہ!"

"رقم نہیں دیتے نہ دیں سر!" وہ روہانسی آواز میں بولا۔ "اگر مارا (ہمارا) گھر اندھیرے میں نہ پڑا ہوتا تو ہم کبھی نہیں آتا صاب! ام نے پہلے اِدھر اُدھر کوشش کیا، پھر آپ کی

طرف آیا۔"

شبیر خان نے اپنے صافے کے پلو سے آنکھوں میں بننے والے آنسوؤں کو پہلے ہی دبا دیا۔ "ہمارا جھوٹ کا عادت نہیں صاب۔" وہ جانے کے لئے مڑا۔ "پرسوں "جشن آزادی" ہے، سب گھر روشن ہوں گے اور امارا گھر، اندھیرے کی تصویر ہو گا، ہم کو بہت افسوس ہو گا صاب! پاکستان کا یومِ آزادی اور امارا قسمت۔" وہ مڑ کر دروازے کی طرف پہنچ گیا۔

ارسلان صاحب اس کے جملے سن کر ایک لمحے کو ٹھٹھک کر رہ گئے۔ اس کے لفظوں میں سچائی تھی۔

"سر! اگر اجازت ہو تو کچھ کہوں۔" کامران صاحب بولے۔ اس عرصے میں خان باہر نکل چکا تھا۔

"ہاں ہاں کہیے کامران صاحب!" ان کا موڈ اب تبدیل ہو چکا تھا۔

"سر! ہم ایک روز اپنی عمارت کو روشن کرنے کے لئے سرکار کا پچیس ہزار روپیہ خرچ کر سکتے ہیں لیکن ایک غریب آدمی کے گھر کو مستقل روشن کرنے کے لیے تین ہزار کی رقم نہیں دے سکتے۔" وہ انتہائی سنجیدگی سے بولے "یہ شخص اپنا گھر روشن کرنا چاہتا ہے اور ہم جشنِ آزادی کے لیے صرف اپنی عمارات کو ایک روز کے لیے جگ مگا کر خوش ہو جائیں گے۔ کیا یہ ظلم اور ناانصافی نہیں سر......؟ کیا شبیر خان کو یومِ آزادی کے دن ہم روشن دل کے ساتھ روشن گھر کا تحفہ نہیں دے سکتے۔"

ارسلان صاحب نے کامران صاحب کی باتوں کو توجہ سے سنا، انہیں غور سے دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے بولے:

"تم ٹھیک کہتے ہو، ہمارے چوکی دار کو بھی اپنا گھر روشن رکھنے کا مکمل حق ہے۔" وہ خوش دلی سے بولے۔ "بلا لو شبیر خان کو!!"

معلوماتِ پاکستان

سمعیہ سندھو (قصور)

سرکاری نام: اسلامی جمہوریہ پاکستان

مذہب: اسلام

مسلمان: 97%

اقلیت: 3%

سرکاری زبان: اُردُو

رقبہ: 796096 مربع کلو میٹر

سرحدیں

پاک چین سرحد

592 کلو میٹر۔

پاکستان کے شمال اور شمال مشرق "گلگت ایجنسی" میں چین کا صوبہ سنکیانگ "Sinkiang" ہے۔

پاک بھارت سرحد

مشرق میں پاکستان کی بھارتی صوبوں پنجاب اور راجستھان سے سرحد ملتی ہے جو ریڈ کلف ایوارڈ کہلاتی ہے اور 1600 کلو میٹر طویل ہے۔

پاک افغان سرحد

افغانستان کے ساتھ مغرب اور شمال مغرب میں سرحد ہے جو ڈیورنڈ لائن کہلاتی ہے۔ یہ سرحد 2252 کلو میٹر طویل ہے۔

پاک ایران سرحد

جنوب مغرب میں پاکستان کی سرحدیں ایران سے ملتی ہیں۔ یہ سرحد 805 کلو میٹر طویل ہے۔

پاک مقبوضہ کشمیر سرحد

یہ سرحد لائن آف کنٹرول کہلاتی ہے، جو آزاد کشمیر کو بھارت کے زیر تسلط ریاست جموں و کشمیر کے علاقہ سے جدا کرتی ہے۔

پہاڑی سلسلے

ہمالیہ، قراقرم، کوہ ہندوکش

صحرا

تھر: وادیٔ سندھ کے جنوب میں، بھارتی صوبہ راجپوتانہ میں کچھ حصہ ہے۔

چولستان: بہاول پور اور بہاول نگر میں واقع ہے۔

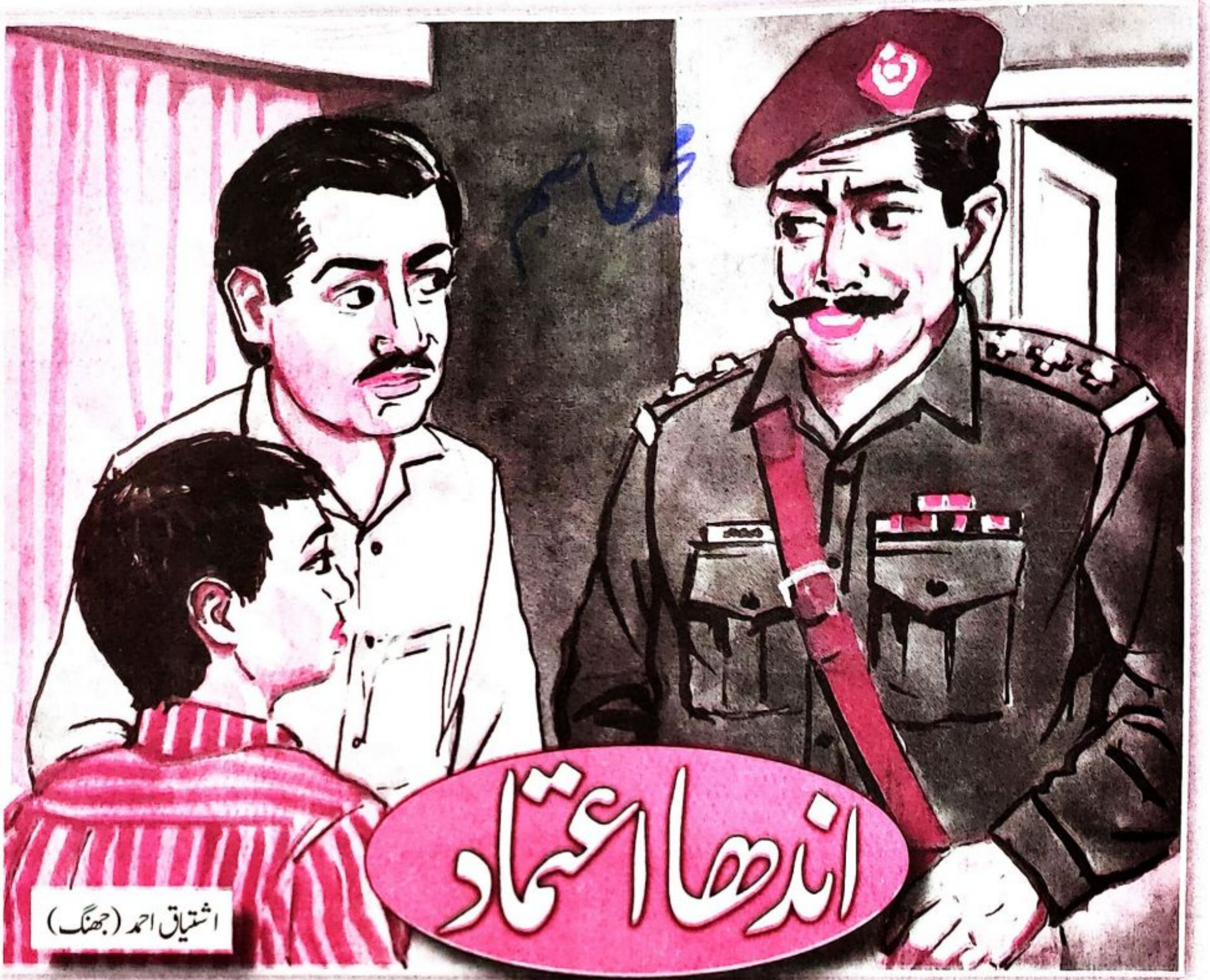

اندھا اعتماد

اشتیاق احمد (جھنگ)

خاور علیم کی آنکھ کھل گئی۔ اُن کے کان کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے صاف محسوس کیا تھا کہ ساتھ والے کمرے کا دروازہ کسی نے آہستہ سے کھلا ہے۔ اُن کا ہاتھ فوراً تکیے کے نیچے رینگ گیا۔ اب اُن کے ہاتھ میں پستول تھا۔ وہ دبے پاؤں اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچے۔ بہت آہستہ انداز میں اُسے کھولا اور باہر نکل آئے۔ اب وہ ساتھ والے کمرے کے دروازے پر آ گئے......

یہ دیکھ کر ان کی آنکھوں میں خوف سما گیا کہ دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا جب کہ سونے سے پہلے وہ خالی کمروں کے دروازوں کو بند کرنا کبھی نہیں بھولتے تھے۔ اِس کا صاف مطلب یہ تھا کہ کسی نے واقعی دروازہ کھولا تھا۔ اب انہوں نے آہستہ آہستہ اُس دروازے کو کھولنا شروع کر دیا...... یہاں تک کہ وہ اندر کا جائزہ لینے کے قابل ہو گئے۔ انہوں نے دیکھا، کمرہ خالی تھا۔

"کیا یہ میرا وہم تھا......" وہ بڑبڑائے۔

پھر وہ کوٹھی کے بیرونی دروازہ کی طرف آ گئے۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ انہوں نے اطمینان کا سانس لیا اور واپس مڑ گئے...... اُس وقت انہیں ایک خیال آیا...... اُن کے قدم ملازم کے کوارٹر کی طرف اٹھ گئے...... ابھی چند روز پہلے ہی انہوں نے ایک نیا ملازم رکھا تھا۔ اس کا کوارٹر کوٹھی کی پچھلی طرف تھا۔ کوارٹر تک آنے جانے کے لیے راستہ کوٹھی میں سے ہی تھا۔ اس راستے کو عبور کر کے وہ کوارٹر کے سامنے پہنچ گئے...... انہوں نے دیکھا...... کوارٹر کا دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا۔ اندر زیرو کا بلب روشن تھا۔ انہوں نے نئے ملازم کو چارپائی پر کروٹیں لیتے دیکھا...... پھر وہ وہاں سے لوٹ آئے۔ انہوں نے چند دن بعد اپنے دوست حسن سلیم کو فون کیا۔ وہ پولیس انسپکٹر تھا۔

"مجھے آپ سے کچھ کام ہے...... اگر آپ آج شام آ جائیں تو شکر گزار ہوں گا۔"

"ضرور کیوں نہیں۔" وہ بولے۔

شام پانچ بجے وہ دونوں لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

"مجھے اپنے نئے ملازم پر شک ہے...... میرا خیال ہے وہ کسی چکر میں ہے۔"

"ابھی چیک کر لیتے ہیں، آپ بتائیں، ہوا کیا ہے؟"

انہوں نے تین چار رات میں جو محسوس کیا تھا، بتا دیا۔ اب حسن سلیم بولے: "اگر میں اس سے کچھ سوالات کروں تو آپ محسوس تو نہیں کریں گے؟"

"بھلا میں کیوں محسوس کرنے لگا، میں نے تو خود آپ کو بلایا ہے۔"

"ٹھیک ہے...... آپ اُسے بلائیں...... نام کیا ہے اُس کا۔"

"عبدالجلیل۔" انہوں نے بتایا۔ اور گھنٹی کا بٹن دبایا۔ جلد ہی عبدالجلیل اُن کے سامنے آ کھڑا ہوا، اُس نے کہا:

"جی صاحب جی۔"

"عبدالجلیل...... یہ حسن سلیم ہیں...... پولیس انسپکٹر۔"

"جی!" اس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔

"چند دن سے میرے دوست خاور علیم بہت پریشان ہیں...... انہوں نے اپنی پریشانی مجھے بتائی ہے...... اس سلسلے میں آپ سے چند سوالات پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"جج......جی......جی......" وہ اور زیادہ گھبرایا۔

"آپ رات کے وقت چوروں کی طرح اپنے کوارٹر سے نکل کر کوٹھی کے رہائشی حصے میں آتے ہیں...... کبھی ایک کمرے میں جاتے ہیں...... تو کبھی دُوسرے میں...... کئی کئی منٹ ہر کمرے میں گزارتے ہیں...... البتہ حسن سلیم کہتے کہتے رک گئے۔

"جی...... البتہ کیا۔" اب اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

البتہ! آپ خاور علیم کے کمرے میں داخل نہیں ہوتے، اس لیے کہ اس میں یہ اپنے بال بچوں کے ساتھ موجود ہوتے ہیں...... کیا آپ وضاحت کریں گے...... آپ ایسا کیوں کرتے ہیں...... کیا آپ کوئی منصوبہ لے کر یہاں آئے ہیں...... اور آپ کا تعلق چوروں یا ڈاکوؤں کے کسی گروہ سے ہے؟"

"نن...... نہیں...... نہیں۔" وہ کانپ گیا۔

"تب پھر آخر آپ کیا کرتے ہیں راتوں کو؟"

"م...... میں......وہ۔"

"انہیں پولیس اسٹیشن لے جانا پڑے گا...... وہاں یہ فرفر سب کچھ بتا دیں گے۔"

"نن...... نہیں...... نہیں...... میں یہیں سب کچھ بتا دیتا ہوں...... میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔"

"ٹھیک ہے...... تم وضاحت کرو۔" حسن سلیم جلدی سے بولے۔

"یہ......یہ......کوٹھی۔" وہ اٹک کر بولا۔

"ہاں، ہاں،! کہو...... یہ کوٹھی کیا؟" حسن سلیم اور خاور علیم ایک ساتھ بولے۔

"یہ کوٹھی...... کسی زمانے میں ہماری کوٹھی تھی۔"

"کیا!" دونوں چلائے۔

"ہاں، میں اسی میں پیدا ہوا تھا...... میرے والد ایک کاروباری آدمی تھے...... ان کا کاروبار خوب پھیلا ہوا تھا...... لیکن پھر اچانک ان کا سارا کاروبار تباہ ہو گیا۔"

"کیا مطلب...... کیسے تباہ ہو گیا؟" دونوں بولے۔

"میرے والد نے اپنے سارے کاروبار کو اپنے ایک گہرے دوست کو سونپا ہوا تھا۔ مطلب یہ کہ تمام معاملات اُس کے ہاتھ میں تھے...... انہیں اپنے دوست پر اندھا اعتماد تھا۔ بس یہ اندھا اعتماد انہیں برباد کر گیا...... وہ انہیں کروڑوں کا نقصان پہنچا کر غائب ہو گیا...... والد صاحب اب مقروض تھے...... قرض اتارنے کے سلسلے میں انہیں اپنا سب کچھ فروخت کرنا پڑ گیا...... یہاں تک کہ یہ کوٹھی بھی...... پھر اس صدمے میں والد چل بسے، والدہ چل بسیں۔ میں اکیلا رہ گیا اور اِدھر اُدھر ملازمت کرتے اپنی گزر بسر کرنے لگا...... میں زیادہ پڑھ لکھ نہیں سکا، ایک دن اس کوٹھی کے لیے ملازم کا اشتہار پڑھا تو جی بے تحاشا چاہنے لگا کہ اس گھر میں ملازمت کر لوں...... چلو اور کچھ نہیں تو بچپن کی یادیں ہی تازہ ہو جائیں گی، بس یہ سوچ کر یہاں ملازمت کر لی...... ورنہ جہاں پہلے میں ملازمت کرتا تھا وہ مجھے یہاں کی نسبت زیادہ تنخواہ دیتے تھے...... بس اس لیے یہاں آیا ہوں...... دل کی حالت عجیب ہے...... کمروں کی دیواروں سے لپٹ لپٹ کر روتا ہوں...... لیکن ظاہر ہے میں ایسا رات کی تاریکی میں ہی کر سکتا ہوں...... بس یہ میرا

جرم...... آپ چاہیں تو مجھے گرفتار کر لیں یا ملازمت سے نکال دیں......" یہاں تک کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

خاور علیم اور سلیم ایک دُوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ آخر حسن سلیم بولے:

"بیٹے! آپ کے پاس اپنے والد کی کوئی تصویر ہے؟"

"جی...... جی ہاں! میرے کپڑوں کے صندوق میں ایسی کئی چیزیں مل جائیں گی۔ جن سے میری باتوں کی سچائی ثابت ہو جائے گی۔"

"ٹھیک ہے...... ہم وہیں چلتے ہیں۔" وہ بول

اب تینوں کوارٹر میں آئے۔ عبدالجلیل نے صندوق کھولا اور اُس میں سے ایک لفافہ نکالا۔ لفافے میں چند تصاویر تھیں۔ اُن میں اس کے والد، والدہ اور اُس کی اپنی بچپن کی تصاویر تھیں۔ یہ تصاویر اس کوٹھی کے مختلف حصوں میں کھینچی گئی تھیں، وہ کچھ دیر تک ان تصاویر کو دیکھتے رہے، پھر حسن سلیم نے کہا:

"علیم صاحب! یہ نوجوان بالکل بے گناہ ہے، اس نے کوئی جرم نہیں کیا۔ نہ یہ کسی جرم کی منصوبہ بندی کر رہا تھا...... اب یہ بات ثابت ہو گئی ہے...... اب آپ کی مرضی ہے اسے ملازم رکھیں یا فارغ کریں...... میرا خیال ہے، اگر آپ اسے ملازمت میں رکھتے ہیں تو اس کا غم یہاں تازہ ہوتا رہے گا...... لہٰذا بہتر ہے کہ اسے کہیں اور ملازمت دلوا دی جائے...... یہ کرایے کا کوئی گھر لے لے...... اور وہاں پُر سکون انداز سے اپنا زندگی بسر کرے...... آپ اس کے لیے اتنا ضرور کر دیں۔"

خاور علیم، حسن سلیم کی بات سن کر سوچ میں ڈوب گئے، آخر انہوں نے اپنا سر اٹھایا اور بولے:

"میرے ذہن میں ایک اور ترکیب آئی ہے۔ یہ نوجوان غربت کی وجہ سے زیادہ پڑھ لکھ نہیں سکا، یہ اعلیٰ تعلیم کے زیور سے محروم رہ گیا، کیوں نہ ہم اس کی یہ کمی پوری کریں، یہ یہیں رہے، اچھی تعلیم حاصل کرے اور پھر میرا کاروبار سنبھالے۔"

"کیا!!!"

"ہاں، میرے ہاں کوئی نرینہ اولاد نہیں ہے...... میں اسے اپنا بیٹا بنا کر یہاں کیوں نہ رکھ لوں۔"

"میرے خیال میں اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے...... یہ تو بہت نیکی کا کام ہو گا...... اور خاور علیم صاحب آپ نے اس نوجوان پر شک ظاہر تھا کہ یہ کسی جرم کی منصوبہ بندی کرنے کے لیے یہاں آیا ہے...... ایسا ثابت نہیں ہوا لیکن تھی یہ منصوبہ بندی ہی۔" یہ کہتے وقت حسن سلیم بھرپور انداز میں مسکرا دیے۔

"جی...... کیا مطلب، کیا...... کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں، یہ نوجوان یہی منصوبہ لے کر یہاں آیا تھا کہ اس طرح اسے گھر کا فرد بنا لیا جائے گا۔" خاور علیم نے مارے حیرت کے کہا۔

"نہیں، نہیں......" عبدالجلیل چلا اٹھا...... اس کی آنکھوں میں خوف دوڑ گیا۔

چند لمحے سکتے کے عالم میں گزر گئے۔ پھر خاور علیم بولے:

"اُف مالک پل بھر میں یہ کیا سے کیا ہو گیا۔"

آپ غلط سوچ رہے ہیں، میری ایسی کوئی منصوبہ بندی نہیں تھی، میں تو بس یہ ارادہ لے کر آیا تھا کہ بچپن کی کچھ یادیں تازہ کر لوں گا میں نے یہاں کوئی چیز نہیں چرائی...... کوئی جرم نہیں کیا اور اگر آپ کا خیال یہی ہے تو میں یہاں سے چلا جاتا ہوں......" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"نہیں خاور علیم...... آپ غلط سمجھے...... میں نے جو یہ جملہ کہا ہے کہ تھی یہ منصوبہ بندی ہی...... تو اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں تھا جو آپ سمجھے ہیں۔" حسن سلیم نے مسکرا کر کہا۔

"تب پھر آپ کا کیا مطلب تھا۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"یہ کہ یہ تھی منصوبہ بندی، لیکن اس نوجوان کی ہر گز نہیں تھی، یہ تو بالکل معصوم ہے، اس کے خیالات پاکیزہ ہیں۔"

تب پھر کیا یہ میری منصوبہ بندی تھی؟" خاور علیم نے حیران ہو کر کہا۔

"جی...... جی نہیں...... یہ قدرت کی منصوبہ بندی تھی......" وہ مسکرا دیے۔

اب تو خاور علیم بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر عبدالجلیل کو سینے سے لگا لیا۔

اب تینوں کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ ☆☆☆

پاکستان کرکٹ ٹیم کے کپتان

نسرین شاہین، کراچی

1947ء میں پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو اِسی سال پاکستان کرکٹ ٹیم بھی بنائی گئی اور فرسٹ کلاس کرکٹ کا آغاز ہوا۔ 1948ء میں ویسٹ انڈیز کی ٹیم نے پاکستان کا دورہ کیا اور ایک ٹیسٹ میچ بھی کھیلا جو برابر رہا۔ اُس وقت تک پاکستان کو ٹیسٹ کا درجہ حاصل نہیں ہوا تھا اس لئے یہ ایک غیر سرکاری میچ تھا۔ 1949ء میں دولت مشترکہ کی ٹیم اور 1951ء میں ایم سی سی نے پاکستان کا دورہ کیا۔ 1952ء وہ سال ہے جب انٹر نیشنل کرکٹ کانفرنس نے پاکستان کو ٹیسٹ کھیلنے والے ملک کا درجہ دیا۔

پاکستان نے اپنا پہلا ٹیسٹ 16 اکتوبر 1952ء کو فیروز شاہ کوٹلہ گراؤنڈ دھلی میں کھیلا۔ یہ ٹیسٹ بھارت نے ایک اننگز اور 70 رنز سے جیتا لیکن پاکستان ٹیم نے فوراً ہی دُوسرا ٹیسٹ منعقدہ لکھنو جیت کر حساب برابر کر دیا۔ پاکستان نے لکھنو ٹیسٹ ایک اننگز اور 43 رنز سے جیت کر دنیائے کرکٹ میں اپنی آمد کی حیران کن خبر دی۔ پاکستان ٹیم کی قیادت عبدالحفیظ کاردار نے کی تھی۔ یوں انہیں پاکستان کے پہلے ٹیسٹ کپتان ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ پاکستان کرکٹ کی اٹھاون سالہ تاریخ میں کئی کامیاب کپتان آئے اور پاکستان کو سرخرو کرنے میں کامیاب رہے۔ پاکستان کرکٹ کے سب سے پہلے کپتان مرحوم عبدالحفیظ کاردار کی قیادت میں پاکستان نے 23 ٹیسٹ میچ کھیلے جن میں سے 6 جیتے 6 ہارے اور 12 ڈرا ہوئے۔ اس کے بعد ہماری کرکٹ ٹیم آگے ہی آگے بڑھتی چلی گئی۔

59-1958ء میں ویسٹ انڈیز کی کرکٹ ٹیم کے دورۂ پاکستان کے موقع پر قومی ٹیم کی قیادت کی ذمہ داریاں فاسٹ بولر فضل محمود کو سونپی گئیں۔ فضل محمود نے 10 میچوں میں پاکستان ٹیم کی قیادت کی جن میں سے 2 جیتے 2 ہارے اور 6 ڈرا ہوئے۔ 62-1961 میں انگلینڈ کی کرکٹ ٹیم کے دورۂ پاکستان کے موقع پر وکٹ کیپر امتیاز احمد کو پاکستانی کرکٹ ٹیم کا کپتان مقرر کیا گیا۔ امتیاز احمد صرف اسی سیریز پاکستان کرکٹ ٹیم کی قیادت کر سکے۔ تین ٹیسٹ میچوں پر مشتمل اس سیریز میں انگلینڈ نے ایک صفر سے فتح حاصل کی۔ پھر 1962ء میں پاکستانی کرکٹ ٹیم کے دورۂ انگلینڈ کے موقع پر پاکستان کرکٹ کنٹرول بورڈ نے مڈل آرڈر بیٹسمین جاوید برکی کو قومی ٹیم کی قیادت سونپی پانچ ٹیسٹ میچوں پر مشتمل اس سیریز میں پاکستان ٹیم کو چار میں شکست ہوئی جب کہ ایک برابر رہا۔ جاوید برکی کی مایوس کن کارکردگی کے بعد پاکستان کرکٹ ٹیم کی قیادت لٹل ماسٹر حنیف محمد کو سونپی گئی۔ انہوں نے گیارہ ٹیسٹ میچوں میں کپتانی کی 2 جیتے 2 ہارے اور 7 ڈرا ہوئے۔ حنیف محمد تقریباً 1967ء میں انگلینڈ کے خلاف انگلش سرزمین پر کھیلی گئی ٹیسٹ سیریز تک پاکستان کے کپتان رہے۔

1968-69ء میں جب انگلینڈ کی کرکٹ ٹیم نے پاکستان کا دورہ کیا تو مڈل آرڈر بیٹسمین سعید احمد کو پاکستانی ٹیم کا نیا کپتان مقرر کیا گیا۔ اس سیریز کے تینوں میچ ڈرا ہوئے۔ 1969-70ء میں نیوزی لینڈ کی ٹیم نے پاکستان کا دورہ کیا تو انتخاب عالم کو پاکستان کرکٹ ٹیم کا کپتان مقرر کیا گیا۔ انتخاب عالم کو پاکستان کی مضبوط ترین ٹیم ملی۔ انہوں نے 1969ء سے 1975ء تک دو مختلف ادوار کے دوران 17 ٹیسٹ میچز میں قیادت کے فرائض انجام دیئے۔ جن میں انہیں صرف ایک ٹیسٹ میں کامیابی ملی، پانچ ہارے اور گیارہ ڈرا ہوئے۔ پھر ماجد خان کپتان بنے۔ 1972-73ء میں انگلینڈ کے خلاف پاکستان میں کھیلی گئی ٹیسٹ سیریز میں ماجد خان کی قیادت میں تین ٹیسٹ میچز کی سیریز کھیلی گئی اور تینوں ٹیسٹ ڈرا ہوئے۔ اس سیریز کے بعد 1974ء میں ایک بار پھر انتخاب عالم کو کپتان بنا دیا گیا اور ٹیم نے انگلینڈ کا دورہ کیا۔ اس سیریز کے تینوں ٹیسٹ بھی ڈرا ہوئے۔ اس سیریز کے بعد 1974-75ء میں پاکستان کی سرزمین پر ویسٹ انڈیز کے خلاف کھیلے گئے دو ٹیسٹ میچوں میں بھی انہوں نے کپتانی کی لیکن پھر 1976ء میں نیوزی لینڈ کی کرکٹ ٹیم کے دورۂ پاکستان کے موقع پر مشتاق محمد کو پاکستانی ٹیم کا کپتان مقرر کر دیا گیا۔ یہ پاکستان کرکٹ کی تاریخ کے سب سے کامیاب اور زیرک کپتان تھے۔ ان کی زیرِ قیادت پاکستان نے کل 19 ٹیسٹ میچز کھیلے۔ جن میں سے آٹھ جیتے، چار ہارے جب کہ سات برابر رہے۔ انہوں نے بطور کپتان پہلی ہی سیریز نیوزی لینڈ کے خلاف جیتی تھی۔ 1977-78ء میں کیری پیکر کرکٹ کھیلنے اور پاکستانی کرکٹرز کے معاوضوں میں اضافے کے مطالبے پر ان سے قیادت چھین کر وسیم باری کے حوالے کر دی گئی۔ وسیم باری کی قیادت میں کھیلے گئے چھ ٹیسٹ میچز میں دو ہارے اور چار ڈرا ہوئے۔ ایک بار پھر بورڈ کو مشتاق محمد کی ضرورت پڑی اور انہیں بھارت کے خلاف ہوم سیریز میں کپتان مقرر کر دیا گیا۔یہ سیریز انہوں نے اپنی شان دار کپتانی کی بناء پر جیت لی۔ مشتاق محمد 1979ء کے اوائل تک کپتان رہے۔

1979ء میں جب پاکستانی کرکٹ ٹیم نے بھارت کا دورہ کیا تو آصف اقبال کو ٹیم کا کپتان مقرر کیا گیا۔ 6 ٹیسٹ میچز کی یہ سیریز بحیثیت کپتان آصف اقبال کی پہلی اور آخری سیریز ثابت ہوئی۔ یہ سیریز پاکستان دو صفر سے ہار گیا۔ 1980ء کے اوائل میں جب گریگ چیپل کی قیادت میں آسٹریلین ٹیم نے پاکستان کا دروہ کیا تو ظہیر عباس، ماجد خان، وسیم راجہ، سرفراز نواز اور عمران خان جیسے سنیئر کھلاڑیوں کی موجود میں قومی کرکٹ ٹیم کی قیادت کی ذمہ داریاں اسٹار بیٹسمین جاوید میانداد

کو سونپی گئیں۔ میانداد نے بحیثیت کپتان پہلی سیریز تو جیت لی لیکن اپنے سینئرز کے دل نہ جیت سکے۔ چنانچہ 82-1981ء میں آسٹریلیا کے دورے سے واپسی کے بعد جاوید میانداد کے خلاف ٹیم میں بغاوت ہو گئی تو کھلاڑیوں نے ان کی قیادت میں کھیلنے سے انکار کر دیا تھا۔ بالآخر جاوید میانداد کو کپتانی چھوڑنی پڑی اور پھر 1982ء میں پاکستانی کرکٹ ٹیم کے دورۂ انگلینڈ کے موقع پر عمران خان کو ٹیم کا نیا کپتان مقرر کیا گیا۔ عمران خان نے تقریباً ڈیڑھ سال تک مختلف سیریز میں پاکستانی ٹیم کی قیادت کی لیکن 1983ء کے آخر میں پاکستان کرکٹ ٹیم کے دورۂ بھارت کے موقع پر عمران خان کے ان فٹ ہو جانے کے باعث ان کی عدم موجودگی میں ایشین بریڈ مین ظہیر عباس کو پاکستانی ٹیم کی قیادت سونپی گئی۔ ان کی قیادت میں پاکستان نے سولہ ٹیسٹ میچز کھیلے تین جیتے، تین ہارے اور 10 ڈرا ہوئے۔ ان کے بعد ایک بار پھر عمران خان کو کپتان بنایا گیا، عمران خان کی قیادت نے پاکستانی ٹیم کو یادگار فتوحات دلوائیں، جن میں ورلڈ کپ 1992ء کی کامیابی بھی شامل ہے۔ عمران خان کی دلیرانہ قیادت میں ٹیم نے انگلینڈ کو انگلینڈ میں اور بھارت کو بھارت میں شکست دی۔ عمران خان نے 48 ٹیسٹ میچز میں کپتانی کی جو کہ ایک قومی ریکارڈ ہے۔ 48 ٹیسٹ میچز میں 14 پاکستان نے جیتے 8 ہارے اور 26 ڈرا ہوئے۔

1992ء میں پاکستان کرکٹ ٹیم کے دورۂ انگلینڈ کے موقع پر جاوید میانداد دوبارہ ٹیم کے کپتان کی حیثیت سے سامنے آئے۔ وہ یہ سیریز دو ایک سے جیتے اور جنوری 1993ء میں نیوزی لینڈ کے خلاف ہیملٹن میں کھیلا گیا واحد ٹیسٹ میچ جیتنے کے باوجود جاوید میانداد کو قومی کرکٹ ٹیم کی کپتانی سے ہٹا دیا گیا۔ جاوید میانداد کی قیادت میں کل 34 ٹیسٹ میچز کھیلے گئے جن میں سے 14 جیتے، 6 ہارے اور 14 ڈرا ہوئے۔ 1993ء میں دورۂ ویسٹ انڈیز کے لئے وسیم اکرم کو پاکستانی ٹیم کا کپتان مقرر کر دیا گیا۔ 1993ء کے آخر میں وسیم اکرم کے زخمی ہو جانے کے باعث وقار یونس نے زمبابوے کے خلاف کراچی میں کھیلے گئے ٹیسٹ میچ میں پاکستان کی قیادت کے فرائض انجام دیئے۔ جنوری 1994ء میں وسیم اکرم کی کپتانی کے خلاف ٹیم کے بیشتر کھلاڑیوں نے بغاوت کر دی، جس کی وجہ سے سلیم ملک کو کرکٹ ٹیم کا کپتان مقرر کیا گیا۔ سلیم ملک نے 12 ٹیسٹ میچز میں پاکستانی کرکٹ ٹیم کی قیادت کی، اُن کی قیادت میں 7 ٹیسٹ جیتے گئے۔ 3 ہارے اور 2 ڈرا ہوئے۔ ان سے قبل وقار یونس نے صرف ایک ٹیسٹ میں ٹیم کی قیادت کی وہ ٹیسٹ پاکستان نے جیت لیا تھا۔

1995ء میں سری لنکا کے خلاف پاکستانی ٹیم کا کپتان رمیز راجہ کو بنا دیا گیا۔ یہ ٹیسٹ سیریز ہوم لینڈ سیریز تھی۔ پانچ ٹیسٹ میچز میں رمیز راجہ نے ٹیم کی قیادت کی۔ ایک میچ جیتا، دو ہارے اور دو ڈرا ہوئے۔ رمیز راجہ کے بعد 1995ء کے دورہء آسٹریلیا کیلئے ایک مرتبہ پھر وسیم اکرم پاکستانی ٹیم کے کپتان بنے وسیم اکرم کی کپتانی میں کل 19 ٹیسٹ میچز کھیلے گئے۔ 10 پاکستان نے جیتے، 5 ہارے اور 4 ڈرا ہوئے۔ پھر سعید انور کو کپتان بنایا گیا۔ انہوں نے پانچ ٹیسٹ میچز میں قیادت کی ایک جیتا، دو ہارے اور دو برابر ہوئے۔ ان کے بعد عامر سہیل کو کپتانی ملی، 6 ٹیسٹ میچز میں سے صرف ایک پاکستان نے جیتا، دو ہارے اور تین ڈرا ہوئے۔ پھر راشد لطیف کپتان بنے تین ٹیسٹ میچوں میں سے ایک جیتا، ایک ہارے اور ایک برابر رہا۔ پھر تو پاکستان کرکٹ میں کپتانی کے حوالے سے میوزیکل چیئر کا کھیل شروع ہو گیا۔ معین خان کے بعد انضمام الحق نے قیادت سنبھالی۔ انہوں نے 18 سے زائد ٹیسٹ میچز میں ٹیم کی قیادت کی، ان میں سب سے بڑی کامیابی بھارت کو اُس کی سرزمین پر چھ ون ڈے انٹرنیشنلز کی سیریز میں دو چار سے شکست دینا انضمام الحق کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ ان کے بعد یونس خان نے ٹیم کی قیادت سنبھالی۔ یونس خان کے بعد محمد یوسف اور پھر شعیب ملک کو کپتان بنایا گیا، یہ دونوں انفرادی کھیل میں تو بہتر رہے مگر بحیثیت کپتان زیادہ کامیاب نہ ہو سکے۔ آج کل کرکٹ ٹیم کی قیادت شاہد آفریدی کر رہے ہیں۔ شاہد ایک اچھے بولر اور اچھے بیٹسمین ہیں۔ ہماری دُعا ہے کہ وہ ایک اچھے کپتان بھی ثابت ہوں۔

پاک سرزمین شاد باد

پروفیسر محمد ظریف خان (کراچی)

اگست کی تیرہ تاریخ تھی۔ آج حسین اور فاطمہ کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اور ہوتا بھی کیوں؟ اُن کے لئے اس سے پُرمسرت بات اور کیا ہوتی کہ انہیں 14اگست کی صبح کو علامہ اقبالؒ کے مزار پر قومی ترانہ پڑھنے والے بچوں کے گروپ میں شامل کر لیا گیا تھا۔ پاکستان کا قومی ترانہ تو انہیں ازبر تھا اور وہ بڑی اچھی طرز میں اُسے پڑھ بھی سکتے تھے۔ "پڑھ سکنا" کیا؟ وہ تو روزانہ اسمبلی میں اُسے پڑھا ہی کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بڑی دل کش آواز عطا فرمائی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ان کا تلفظ بھی بڑا اچھا تھا۔ اس لئے وہ ہر روز صبح اسمبلی کے وقت طلبا وطالبات کے اس پانچ رکنی گروپ میں شامل ہوتے جو قومی ترانے کے بول ادا کرتا اور سامنے کھڑے ہوئے دیگر بچے اُن کی آواز میں آواز ملایا کرتے تھے۔ ان کے سکول کی اچھی روایت یہ تھی کہ اُس میں اسمبلی کے دوران قومی ترانے کا ریکارڈ شدہ ٹیپ، لاوڈ سپیکر کے ذریعہ سنایا نہیں جاتا تھا بل کہ بچے اپنی یادداشت کے ذریعہ اسے زبانی پڑھا کرتے، جس کی وجہ سے وہ انہیں یاد ہو جاتا اور وہ بہتر طرز کے ساتھ اُسے پیش کر سکتے تھے۔ تیرہ سالہ حسین آٹھویں جماعت میں جب کہ گیارہ برس کی فاطمہ چھٹی جماعت میں پڑھتی تھی۔ اپنی عمروں کے مطابق دونوں بچے تعلیمی مراحل صحیح وقت میں طے کر رہے تھے۔

شام کا وقت تھا۔ دونوں بچے عصر کی نماز اور عصرانے سے فارغ ہو چکے تھے اور اب باآواز بلند بار بار جھوم جھوم کر پڑھ رہے تھے۔

پاک سرزمین شاد باد کشورِ حسین شاد باد
تو نشانِ عزمِ عالی شان ارضِ پاکستان
مرکزِ یقین شاد باد

اُن سے کچھ دُور اُن کی امی ایک گھنے درخت کے نیچے کرسی ڈالے بیٹھی تھیں۔ وہ بڑے پیار اور فخر کے ساتھ اپنے بچوں کو قومی ترانہ پڑھنے کی مشق کرتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ اب تو انہیں اگلے روز یعنی 14اگست کی صبح آٹھ بج کر دو منٹ کا انتظار تھا جب پرچم کشائی کے بعد قومی ترانہ پڑھا جائے گا جس کے ادا کرنے والے شرکاء میں اُن کے بچے بھی شامل

ہوں گے۔ ٹی وی سے آزادی کی تقریبات کا حال براہ راست نشر کیا جاتا ہے وہ دل ہی دل میں یہ سوچ کر خوش بھی ہو رہی تھیں کہ کل صبح وہ اپنے بچوں کو ٹی وی پر ترانہ پڑھتے ہوئے دیکھ سکیں گی۔ وہ کیا......؟ پورا ملک ہی دیکھے گا۔ فاطمہ اور حسین کے ابو، علی خان صاحب جو ایک نیم سرکاری ادارے میں اچھے عہدے پر فائز تھے ابھی تک دفتر سے واپس نہیں آئے تھے۔ وہ اپنے بچوں کو اس طرح عمدہ لحن کے ساتھ قومی ترانہ پڑھتے ہوئے دیکھتے تو یقیناً اپنی بیگم یعنی تحریم خان کی مانند خوشی سے جھوم جاتے، لیکن یہ کیا......؟ ترانہ پڑھتے پڑھتے حسین جب ان مصرعوں تک پہنچا۔

پرچمِ ستارہ و ہلال رہبرِ ترقی و کمال

ترجمانِ ماضی......

تو وہ باقی مصرعے ادا نہ کر پایا اور نہ جانے کیوں بے ساختہ اُسی کی ہنسی چھوٹ گئی۔ اُس کو قہقہے لگاتے ہوئے دیکھ کر فاطمہ بھی اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکی اور وہ بھی زور زور سے ہنسنے لگی۔

تحریم خانم جو اپنے بچوں کا ترانہ سنتے ہوئے یہ دُعا کر رہی تھیں کہ خدا کرے کل صبح آٹھ اور نو کے درمیان بجلی کی لوڈ شیڈنگ نہ ہو ورنہ وہ اپنے بچوں کو ترانہ پڑھتے ہوئے دیکھنے سے محروم رہ جائیں گی وہ حسین اور فاطمہ کو اسی طرح دیوانوں کی طرح ہنستے ہوئے دیکھ کر بڑی حیران ہوئیں اور پھر انہیں ڈانٹ کر کہا:

"حسین......! فاطمہ......! یہ کیا کھی کھی لگا رکھی ہے...... قومی ترانے پڑھتے ہوئے یہ ہنسی ٹھٹھا کس لیے؟"

"امی......! امی ی ی ی ...... وہ...... وہ...... اس لئے...... کہ......"

حسین نے اپنی ہنسی روکنے کی کوشش کرتے ہوئے اٹک اٹک کر کہنا شروع کیا۔ اُس کے اس انداز پر تحریم خانم کو سچ مچ غصہ آگیا اور انہوں نے گرج کر حسین کی بات کاٹتے ہوئے کہا:

"حسین! تمہیں شرم آنی چاہیے اس بات پر...... قومی ترانہ اس طرح پڑھا جاتا ہے......؟ یہ عزت ہوتی ہے اس کی...... لگتا ہے تم رٹو طوطے کی طرح بس اسے دھراتے رہتے ہو...... تم قومی ترانے کی عزت واحترام سے ناواقف ہو۔"

امی کی غصہ بھری سرزنش سن کر جہاں حسین کی ہنسی رک گئی وہیں فاطمہ بھی سہم کر رہ گئی۔ وہ ابھی تک ہنس رہی تھی مگر یک دم اُس کے قہقہوں کے سیلاب کے سامنے جیسے بند باندھ دیا گیا ہو۔ وہ بھی خاموش ہو گئی۔ مگر پھر دونوں منہ پھلا کر وہیں سبزہ زار کے ایک کونے میں جا بیٹھے۔ انہوں نے مشق روک دی تھی۔ اب وہ خوش ہونے کے بجائے اداس اداس نظر آ رہے تھے۔

پھر اسی وقت بنگلے کے باہر سے کسی کار کے مخصوص ہارن کی آواز سنائی دی۔ علی خان دفتر سے واپس آچکے تھے۔ گھریلو ملازم شمشیر نے لپک کر صدر دروازہ کھول دیا۔ علی خان کی گاڑی سست رفتاری کے ساتھ چلتی ہوئی اپنی مخصوص جگہ پر جا کر کھڑی ہو گئی۔ علی خان گاڑی سے نکلے تو گھر کی سنجیدہ بلکہ اُداس فضا کو محسوس کر کے کچھ چونک سے گئے۔ آج نہ تو بیگم نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور نہ حسین اور فاطمہ ہی دوڑتے ہوئے ان تک پہنچے تھے۔ بنگلے میں ایک پُراسرار خاموشی کا راج تھا۔ انہوں نے بچوں کے قریب پہنچ کر انہیں پیار کرتے ہوئے اس کا سبب دریافت کیا تو وہ تو کچھ نہ بولے مگر تحریم خانم نے انہیں بچوں کی جانب سے قومی ترانے کی "توہین" کا قصہ مختصر الفاظ میں سنا دیا۔ جسے سن کر وہ کچھ بولے نہیں۔ وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں چلے گئے۔ چوں کہ مغرب کا وقت قریب تھا اس لئے انہوں نے وضو کیا۔ وہ جب غسل خانے سے باہر نکلے تو فضا میں اذان کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ انہوں نے حسین کو اپنے ساتھ لیا اور نماز باجماعت ادا کرنے کے لئے مسجد چلے گئے جب کہ تحریم خانم اور فاطمہ نے وہیں بنگلے کے سبزہ زار میں نماز پڑھ لی۔

تقریباً بیس منٹ بعد علی خان اور حسین نماز سے فارغ ہو کر واپس آگئے۔ کچھ دیر بعد اہل خانہ برآمدے میں پڑی ہوئی کرسیوں پر آبیٹھے۔ تحریم خانم نے ایک چھوٹی سی میز

وہاں رکھی اور اس پر چائے کا مختصر سا سامان سجا دیا۔ پھر انہوں نے گرماگرم چائے کا ایک کپ بنا کر علی خان کو پیش کیا۔ خان صاحب نے چائے کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے حسین سے سوال کیا۔

"ہاں تو بیٹے......! اب یہ بتاؤ کہ تم اور فاطمہ قومی ترانے کی مشق کرتے ہوئے قہقہے کیوں لگانے لگے تھے؟"

"ابو جی......! ہمیں اس بات پر ہنسی آگئی تھی کہ ہم روزانہ قومی ترانہ پڑھتے اور سنتے ہیں مگر اس کا مطلب نہیں جانتے۔ یعنی ہم اس کے معنی و مفہوم سے واقف نہیں۔"

"ایں...... کیا مطلب؟ اس کے معنی و مفہوم سے تم لوگ کیوں واقف نہیں ہو؟" انہوں نے سوال کیا۔

"ابو جی......! وہ اس لئے کہ یہ بڑی مشکل زبان میں لکھا گیا ہے۔ اس کا تو بس ایک آدھ لفظ ہی ہماری سمجھ میں آتا ہے۔" حسین نے بڑی سادگی کے ساتھ کہا۔

"ابو جی! وہ اس لئے کہ یہ بہت مشکل زبان میں لکھا گیا ہے، ہماری اُردُو کی ٹیچر نے بتایا ہے کہ پورا ترانہ فارسی زبان میں ہے...... اس میں اُردو کا صرف ایک لفظ "کا" استعمال ہوا ہے جیسے پاک سرزمین کا نظام۔"

فاطمہ نے حسین کی ہاں میں ہاں ملا کر بات کو آگے بڑھایا۔

"بچو! تم بڑی حد تک اپنی سمجھ کے مطابق صحیح بات کر رہے ہو۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ اس ترانے میں کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں جو ہماری روزمرہ کی بات چیت، گفت گو یا بول چال میں استعمال نہ ہوتا ہو۔ تم یہ بات تو جانتے ہو نا کہ اُردُو زبان کئی زبانوں سے مل کر بنی ہے...... بھلا کون کون سی؟" انہوں نے الٹا حسین ہی سے سوال کر ڈالا۔

"ابو جی......! یہ تو مجھے معلوم ہے اُردو میں زیادہ تر عربی، فارسی اور ہندی کے الفاظ شامل ہیں۔ اِس کے علاوہ ترکی اور پرتگالی زبانوں کے علاوہ کچھ الفاظ انگریزی کے بھی ہیں۔"

"تو بیٹا......! اب تم خود ہی بتاؤ کہ یہ پورا ترانہ فارسی میں کس طرح ہوا؟" انہوں نے کہا اور پھر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولے:

"بیٹا......! بات یہ ہے کہ جن دنوں یہ ترانہ لکھا گیا اُس وقت فارسی اور عربی کا عام چلن تھا۔ تقریباً تمام پڑھے لکھے لوگ حتیٰ کے ہندوؤں اور سکھوں کی بڑی تعداد بھی فارسی اور عربی سے واقف تھی۔ پاکستان اور ہندوستان کی کئی ریاستوں مثلاً حیدر آباد دکن، بھوپال، رام پور، ٹونک، پٹیالہ، خیرپور، بہاول پور، قلات، لسبیلہ اور چترال میں دفتری اور سرکاری زبان فارسی تھی۔ خود پنجاب میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سکھ حکومت کی دفتری اور سرکاری زبان فارسی تھی۔ اور پھر پاکستان کے قومی ترانے میں فارسی، عربی زبانوں کے جو الفاظ شامل ہیں اگر میں ان کے الگ الگ معنی تم سے پوچھوں تو تم فرفر بتا دو گے۔"

"مثلاً کون کون سے؟" حسین نے بے تابی کے ساتھ دریافت کیا۔

"مثلاً پاک" انہوں نے پہلا لفظ ادا کیا اور پھر بولے: "مطلب بتاؤ اس کا۔"

"ابو! یہ تو آسان لفظ ہے" حسین مسکراتے ہوئے بولا: "اس کا مطلب ہے صاف ستھرا، پاکیزہ یعنی گندگی سے محفوظ۔ اس نے پاک کے کئی معنی بتا دیئے۔

"اور سرزمین؟" انہوں نے ایک اور لفظ کے معنی پوچھے۔

"ابو جی......! یہ بھی بڑا آسان لفظ ہے۔" اس بار فاطمہ جھٹ سے بول اٹھی۔

"اس کا مطلب ہے۔ زمین کا حصہ یا ٹکڑا جو عام طور پر وطن کی زمین کے لئے استعمال ہوتا ہے۔" اُس نے بتایا۔

"شاباش......! بھئی ماشاء اللہ تم تو حسین سے بھی زیادہ ذہین ہو۔"

انہوں نے فاطمہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور پھر ہر لفظ کے الگ الگ معانی بیان کر دیئے۔ ان میں کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہ تھا جس کے معنی و مفہوم سے وہ لوگ پہلے سے واقف نہ ہوں۔ پھر انہوں نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ کہا:

"بچو! یہ ترانہ بچوں کے لئے اس لئے، مشکل ہے کہ فی زمانہ فارسی اور عربی کا ذوق کم بل کہ ختم ہوتا جارہا ہے۔ ہمارے زمانۂ طالب علمی میں آٹھویں جماعت تک فارسی اور عربی پڑھائی جاتی تھی۔ اس لیے ہم اپنے قومی ترانے کو باآسانی سمجھ لیا کرتے تھے۔ یاد رکھیو.....! عربی، فارسی اور ترکی ہماری قومی زبان اُردو کے بنیادی عناصر ہیں۔ اگر ہم نے انہیں فراموش کیا تو ایک روز اپنی قومی زبان سے بھی بے گانہ ہو جائیں گے۔ یہ زبانیں مسلمانوں کا عظیم ورثہ ہیں جن سے کم ازکم ہر پاکستانی کو واقف ہونا چاہیے تاکہ وہ اُردو کو مزید فروغ دے سکے۔ اور تم یہ بتاؤ کے قومی ترانہ کس کا لکھا ہوا ہے؟" انہوں نے سوال کیا۔

"جی ابو..... حفیظ جالندھری نے۔" حسین نے جواب دیا۔

"جی ہاں.....! حفیظ جالندھری نے اور ہاں..... یہ بھی یاد رکھو کہ پاکستان کا قومی ترانہ جس کمیٹی نے منظور کیا اُس میں پاکستان کی تمام زبانیں بولنے والے معروف لوگ شامل تھے۔ ان دنوں موجودہ بنگلہ دیش یعنی سابق مشرقی پاکستان سے بنگالی زبان بولنے والا ایک ہندو بھی شریک تھا مگر کسی نے اس ترانے پر اعتراض نہیں کیا اور نہ اسے مشکل قرار دیا۔" علی خان بولے۔

"کسی نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا؟" فاطمہ نے حیرت زدہ ہو کر سوال کیا۔

"جی بیٹا.....! کسی نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ وہ اس لئے کہ ہمارے ملک کا قومی ترانہ، قومی پرچم، قومی لباس اور قومی زبان کی طرح نہ صرف ہمارے پیارے وطن کی پہچان ہے بل کہ اسلامی دُنیا سے ہمارے روایتی اور مذہبی تعلقات کو فروغ دینے کا ذریعہ بھی ہے۔ اس میں شامل الفاظ اُردو اور پاکستان کی علاقائی زبانیں بولنے والے افراد کے علاوہ عربی، فارسی اور ترکی زبانیں بولنے والے لوگ بھی سمجھ سکتے ہیں۔" انہوں نے بتایا اور پھر کچھ دیر بعد بولے:

"بچو! یاد رکھو.....!" ترانہ محض الفاظ کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ جذبات واحساسات کے اظہار کا ذریعہ بھی ہوتا ہے۔ جنوبی افریقہ کا ترانہ گیارہ عدد علاقائی زبانوں سے مل کر بنا ہے۔ مگر وہاں کے عوام مجموعی طور پر اس پر فخر کرتے ہیں، امریکہ کا قومی ترانہ اتنی مشکل اور قدیم انگریزی زبان میں ہے کہ بہت کم لوگ اسے سمجھ پاتے ہیں۔ برطانیہ میں سینکڑوں برس تک جو قومی ترانہ پڑھا جاتا رہا وہ لاطینی زبان میں تھا۔ اور تو اور..... دُنیا کے کئی ملک ایسے ہیں جن کا ترانہ الفاظ کے بجائے صرف موسیقی پر مشتمل ہے۔ جب کہ اردن کا ترانہ صرف چار مصرعوں والا ہے اور....."

"آپ! اب بس بھی کریں..... آپ تو قومی ترانے کی اہمیت واضح کرنے کے بجائے لمبی تقریر کرنے بیٹھ گئے ہیں۔"

تحریم خانم نے اُن کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ اُن کی اس بات نے فضا کی سنجیدگی کو کم کیا اور سب کے لبوں پر مسکراہٹ بکھرگئی۔ جب کے اُدھر حسین بڑے عزم کے ساتھ کہہ رہا تھا۔

"ابو جی.....! آپ کی ہر بات ہماری سمجھ میں آگئی ہے، اب ہمیں قومی ترانے کی اہمیت کا احساس ہو گیا ہے..... یہ بالکل بھی مشکل نہیں۔ اسے مشکل قرار دینے والے لوگ قومی جوش وجذبہ سے محروم ہیں۔ ان شاء اللہ ہم کل جب یہ ترانہ پڑھیں گے تو یہ سچ مچ ہمارے دل کی آواز ہو گا۔" پھر اُس نے فاطمہ سے کہا:

"ہاں فاطمہ..... مشق شروع کرو..... ایک..... دو..... تین۔" اور اس کے ساتھ ہی فضا میں "پاک سرزمین شاد باد کشورِ حسین شاد باد" کی مترنم صدائیں گونجنے لگیں۔ اب تو ابو اور امی بھی اُن کی آواز میں آواز ملا رہے تھے۔ پھر اچانک ایک بھاری اور باٹ دار آواز بھی ترانہ پڑھنے والوں میں شامل ہو گئی۔ یہ شمشیر تھا..... گھریلو ملازم مگر گھر کا ایک فرد..... جو نہ جانے کب خاموشی کے ساتھ ان لوگوں کے عقب میں آکر کھڑا ہو گیا تھا۔

---☆☆---

یہ کیا ہُوا؟

فارح فجیع (اسلام آباد)

آصف کے لیے کل کا دن بہت اہم تھا۔ کل اس کی چھٹی سالگرہ تھی۔ کل ہی پہلی مرتبہ اُس نے سکول بھی جانا تھا۔ ابھی پرسوں ہی تو اُس کا داخلہ گاؤں سے کچھ دُور واقع ایک سکول میں ہوا تھا اور وہ کل سکول جانے کی تیاری کر رہا تھا۔

گول مٹول آنکھوں اور سرخ گالوں والا آصف چھوٹے سے قد کا مالک تھا اور اس کی خوب صورتی عام بچوں سے کچھ الگ سی تھی۔

رات کو سونے سے پہلے آصف نے اپنی ماں کو کہا تھا:

"امی میں کل جمعہ کی نماز مسجد میں ادا کروں گا...... اب میں بڑا ہو گیا ہوں۔"

اُس کی ماں نے اُسے خوشی سے اجازت دے دی تھی۔

"اور امی! میں جلدی مسجد جاؤں گا۔ اور پہلی صف میں کھڑا ہو کر نماز پڑھوں گا۔"

"اچھا بیٹا اب سو جاؤ۔ صبح آپ نے جلدی جاگنا ہے۔"

وہ یہ کہہ کر اُس کے کمرے سے نکل آئیں۔

آصف کا باپ ایک مزدور تھا۔ اور چار سال پہلے وہ ایک گھر کی تعمیر کے دوران چھت سے گر کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ یوں آصف کو اُس کی ماں نے ہی پالا پوسا تھا۔ اُن کے رشتہ دار اُن کو تنہا چھوڑ گئے تھے...... آخر دُنیا مطلب کی ہے......! آصف اور اس کی ماں بہت مشکل سے زندگی گزار رہے تھے۔ آصف کی ماں کا ایک سہارا اللہ اور دُوسرا اُس کا بیٹا تھا۔ اُس کی اُمیدوں کا سہارا......! اس کی ڈگمگاتی کشتی کا ساحل...... اس کی تمام خواہشات کا مرکز......! اور وہ اُسے ایک بڑا آدمی بنانا چاہتی تھیں۔

یہ پشاور کا ایک نواحی گاؤں تھا۔ موسم آج بہت خوشگوار تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ سورج بادلوں کی اوٹ میں چھپا ہوا تھا۔ وہ جمعہ کا دن تھا...... آصف اپنی ماں سے بریانی پکانے کرنے کی خواہش کرنے کے بعد سکول روانہ ہو گیا۔ آج اس

کی خوشی دیدنی تھی...... اُس کی آنکھوں میں چمک تھی۔

سکول میں اُسے بہت مزہ آیا تھا۔ جمعہ کی وجہ سے چھٹی جلدی ہی ہو گئی تھی۔ اب وہ گھر واپس آ چکا تھا...... اُس کی ماں اس کی منتظر تھی...... وہ اس کی خواہش کے مطابق بریانی تیار کر چکی تھیں...... آخر وہ ان کا اکلوتا لاڈلا بیٹا جو تھا...... اس نے بریانی کھانے سے انکار کر دیا تھا۔

"امی بریانی نماز پڑھ کر ہی کھانا کھاؤں گا......!"

یہ کہہ کر وہ کپڑے بدلنے لگا...... نہ جانے اُسے کیا جلدی تھی؟ بہرحال وہ نماز سے ٹھیک ایک گھنٹے پہلے مسجد میں موجود تھا۔

اُس وقت مسجد میں وہ تھا اور ایک اور آدمی...... ابھی تو قاری صاحب بھی تشریف نہیں لائے تھے۔ اُس آدمی کے لمبے لمبے بال تھے اور داڑھی شاید برائے نام تھی۔ موسم ٹھنڈا ضرور تھا پر اتنا بھی نہیں کہ "جیکٹ" پہنی جائے......" اور اتنی بھاری جیکٹ؟ آصف اس کے قریب جا کر اُس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس نے آصف کو عجب نظروں سے دیکھا تھا۔

اب قاری صاحب بھی مسجد میں آ چکے تھے۔ وہ شخص جو سب سے پہلے مسجد میں پہنچا تھا سر جھکائے بیٹھا تھا۔ وہ بہت پُراسرار تھا۔ اب وہ تیز تیز کوئی ورد کر رہا تھا۔ قاری صاحب کی تقریر ختم ہوئی اور خطبے کے بعد نماز جمعہ ادا کرنے کے لئے سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ آصف نے سب کی تقلید کی۔

آصف کی ماں اس کے انتظار میں تھی۔ مسجد ان کے گھر سے زیادہ دُور نہیں تھی۔ انہوں نے آصف کے لئے شربت تیار کیا۔ پھر اس کی سالگرہ کا تحفہ الماری سے نکال کر دسترخوان پر ہی رکھ دیا۔ وہ اُسے یہ تحفہ دے کر اس کو خوش کرنا چاہتی تھیں۔ اُن کا دل بُری طرح سے دھڑک رہا تھا۔ پتہ نہیں کیوں ان کو کوئی اضطراب تھا، کوئی شک تھا، وہ دروازے سے باہر آ گئیں...... اُن کی نظریں مسجد کی جانب مرکوز تھیں۔

ایک زور دار آواز آئی......! اور مسجد کی دیوار کے پرخچے فضا میں بلند ہوئے۔ یہ ایک دھماکے کی آواز تھی...... آصف کی ماں یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔ اُن کا دل دہل کر رہ گیا۔ آخر ان کا لخت جگر وہاں تھا......! وہ گھبرا کر مسجد کی جانب بھاگیں۔ وہاں عجیب ہی منظر تھا۔ ہر طرف انسانی اعضاء بکھرے پڑے تھے۔ ہر طرف چیخ و پکار تھی۔ لوگ زخمیوں کو گاڑیوں میں ڈال رہے تھے۔ کسی کو کسی کی خبر نہ تھی...... آصف معصوم کہاں تھا؟ اس کی ماں کو فوری طور پر معلوم نہ ہو سکا...... اب وہ ایک ہسپتال میں جا پہنچی تھیں۔

ان کو وہاں ایک آدمی نے بتایا کہ یہاں کچھ شہداء کو لایا گیا ہے اور اُن میں بچے بھی شامل ہیں۔ ان کا دل مزید گھبرا گیا۔ وہ اب ایمرجنسی وارڈ میں تھیں۔ ایک نرس نے اُن سے آصف کے خدوخال کے بارے میں پوچھا۔ اور آخر کار نرس نے اُن کو آصف کی موت کی دردناک خبر سنا دی۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

کچھ دیر بعد آصف کی میت اُن کے سامنے لائی گئی۔ سلام اس ماں پر جس کی آنکھوں سے اب آنسو بھی نہ بہہ رہے تھے بلکہ ان کا چہرہ پُرسکون تھا۔ آصف کا چہرہ مسکرا رہا تھا۔ پُرسکون چہرے پر کہیں بھی زخم کا نشان نہ تھا...... وہ یوں تھا جیسے سو رہا ہو...... پُرسکون نیند۔ ابدی نیند...... اب وہ شہداء کی صف میں شامل ہو چکا تھا۔ وہ بھی اتنی چھوٹی سی عمر میں۔

اس کی ماں کو اس بات کا دکھ ضرور تھا کہ ان کے ہاتھ کی بنی بریانی کھائے بغیر ان کا لاڈلا دُنیا چھوڑ گیا تھا۔ اس نے تو کہا تھا کہ میں کھانا واپس آ کر کھاؤں گا......! اُس نے تو ابھی اپنی سالگرہ منانی تھی...... ماں سے تحفہ وصول کرنا تھا...... اس کی ماں اب دُنیا میں تنہا تھی...... اس کا آخری سہارا بھی اس سے چھین لیا گیا تھا۔ اس کی ماں کو عینی شاہدین نے بتایا کہ جب نمازی پہلا سجدہ کر رہے تھے تو دھماکا ہوا تھا، یوں یہ آصف کا پہلا اور آخری سجدہ تھا...... آصف کی موت کے بعد اس کی ماں کا صبر دیکھنے والا تھا۔ آخر اس کا ننھا آصف شہید جو تھا......! وہ تحفہ جو اس نے آصف کو دینا تھا آج بھی اس نے سنبھال کر رکھا ہوا ہے......!

جب آصف کو لحد میں اتارا جا رہا تھا تو سورج بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا جیسے اس ننھے شہید کو سلام پیش کر رہا ہو......!

☆☆

یہ دونوں تصاویر بظاہر ایک جیسی لگ رہی ہیں، لیکن ان میں 5 جگہ پر فرق ہے۔ کیا آپ یہ فرق تلاش کر سکتے ہیں؟

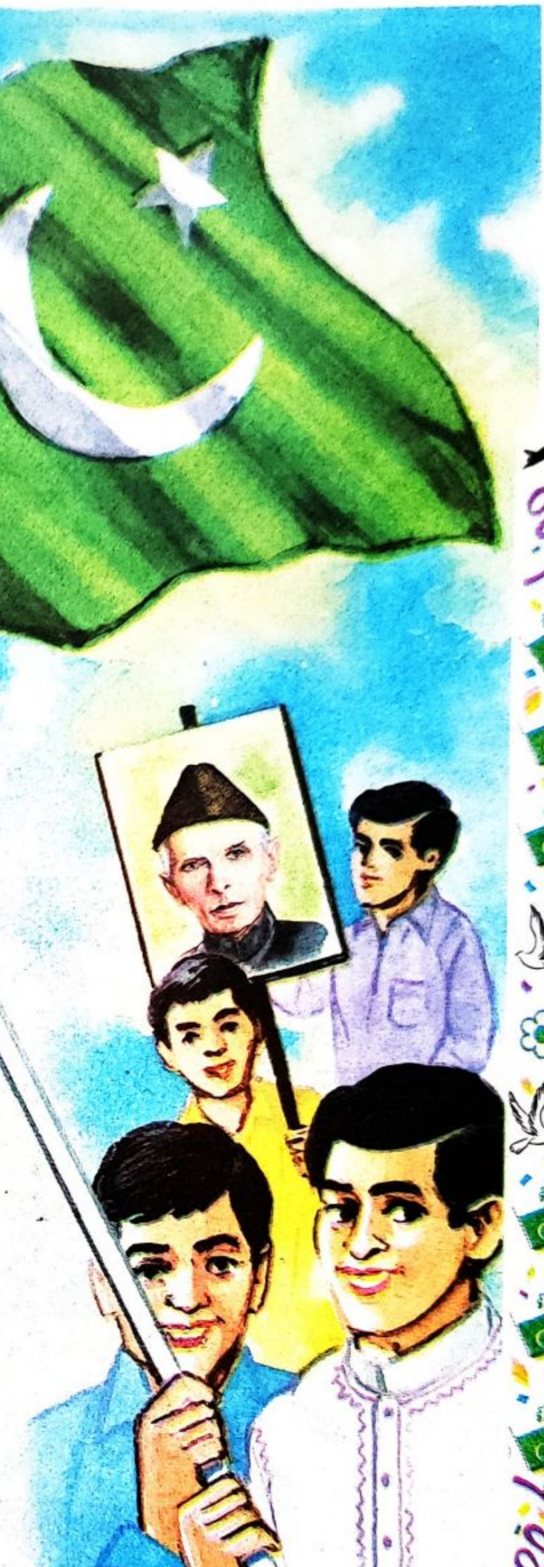

معمارِ وطن

معمار ملکِ پاک کے ہم نوجوان ہیں
سرمایہ ہم وطن کا ہیں ، ملت کی شان ہیں
معمار ملکِ پاک کے ہم نوجوان ہیں
قائد کا مان ہم ہیں ، سراپا چٹان ہیں

معمار ملکِ پاک کے ہم نوجوان ہیں
علم وہنر کے چاند اُگاتے رہیں گے ہم
دُنیا کو آن بان دکھاتے رہیں گے ہم
پرچم محبتوں کے اُڑاتے رہیں گے ہم

معمار ملکِ پاک کے ہم نوجوان ہیں
جان اور دل سے آئیں گے ملت کے کام ہم
اِسلام کا سُناتے رہیں گے پیام ہم
اِک روز پھر سنبھالیں گے ملکی نظام ہم

معمار ملکِ پاک کے ہم نوجوان ہیں
اللہ کے کلام سے دل شاد باد ہے
تنظیم ہے ، یقین ہے ، اِتحاد ہے
فرمان ہم کو قائد اعظمؒ کا یاد ہے
معمار ملکِ پاک کے ہم نوجوان ہیں

ضیاء الحسن ضیاء ، کراچی

ایک سبق نیا

جدون ادیب (کراچی)

ندیم کے پاس بہت سارے طوطے تھے۔ اُس نے اپنے طوطوں کے لیے چھت کے ایک کونے میں ایک بڑا سا پنجرہ بنا رکھا تھا۔ اس پنجرے کے دو حصے تھے۔ ایک میں آسٹریلین طوطے تھے جو رنگ برنگے اور معصوم طوطے تھے۔ دُوسرے حصے میں بڑی دُم والے آسٹریلین طوطے تھے۔ پہلے سب ساتھ رہتے تھے پھر جب ندیم نے دیکھا کہ اکثر ان کے بیچ لڑائی ہو جاتی ہے تو اُس نے درمیان میں تختہ لگا کر پنجرے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ بڑے پنجرے کے پاس ایک چھوٹا سا پنجرہ اور تھا جس میں ندیم کا پسندیدہ مٹھو طوطا بند رہتا تھا۔ مٹھو اکیلا تھا اور اکثر اداس اور خاموش بیٹھا رہتا تھا۔

ندیم سکول سے آ کر پہلے طوطوں کے دانے پانی کا بندوبست کرتا پھر خود کھانا کھاتا تھا۔ گھر میں دو نوکر بھی تھے مگر وہ اپنے طوطوں کی خدمت خود کرنا پسند کرتا تھا۔

ندیم کے والد فہیم صدیقی ایک با اثر سیاسی کارکن تھے۔ وہ رام پور کے معززین میں شمار ہوتے تھے اور ایک عرصے سے کانگریس کے ساتھ وابستہ تھے اور عین جوانی میں سیاسی کیسوں میں کئی بار جیل جا چکے تھے۔ وہ انگریزوں سے آزادی کے لیے مہاتما گاندھی کو ہندوستانیوں کا واحد نجات دہندہ سمجھتے تھے اور ان قوتوں کے حامی تھے جو ہندوستان کی مذہبی بنیادوں پر تقسیم کے خلاف تھے۔

فہیم صدیقی یہ نہیں سمجھ پاتے تھے کہ مسلمان علیحدہ وطن کیوں مانگتے ہیں۔ وہ حیران تھے کہ جن علاقوں کے پاکستان میں شامل ہونے کا بالکل بھی امکان نہیں تھا وہاں کے مسلمان بھی پاکستان کے پُر جوش حمایتی تھے۔ چاروں طرف سے سکھوں اور ہندوؤں میں گھرے ہوئے مسلمان بھی پاکستان کا نعرہ بلند کر رہے تھے۔

فہیم صدیقی کا خیال تھا کہ ہندوستان کی ترقی اور سالمیت ہندو مسلم کے ایک ہونے میں ہے۔ وہ دُوسرے کانگریسی مسلمانوں کی طرح پاکستان کے قیام کے اعلانیہ مخالف تھے مگر ان کے برعکس ان کے گھر والے جو عرصے سے کانگریسی تھے اپنی سوچ اور پسند بدل چکے تھے اور وہ بھی پاکستان کی حمایت کرتے تھے۔ فہیم صدیقی کو اپنے گھر والوں کے رویے پر

تشویش اور دکھ تھا مگر وہ کوشش کے باوجود اپنے گھر والوں کو پاکستان کی حمایت سے باز نہیں رکھ سکے تھے۔

ندیم نے اپنے دوستوں کی دیکھا دیکھی چھت پر پاکستان کا مجوزہ ہرا جھنڈا لہرادیا تھا۔ فہیم صدیقی جیسے کانگریسی کارکن کے لیے یہ تشویش کی بات تھی۔ وہ ندیم کو سمجھانا چاہتے تھے کہ اس طرح اپنی رائے کا برملا اظہار نقصان کا سبب بن سکتا ہے۔ وہ ندیم سے بات کرنے چھت پر آئے تو وہ اپنے اداس مٹھو کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا۔ فہیم صدیقی بڑے پنجرے کے پاس آئے اور پنجرے کے بیچ میں لکڑی کے تختے کے ذریعے سے پنجرے کو دو حصوں میں تقسیم دیکھ کر چونک گئے اور ندیم سے پوچھا:

”ندیم بیٹے! ان طوطوں کو کاہے کو الگ رکھتے ہو...... یہ ساتھ بھی تو رہ سکتے ہیں۔“

ندیم اپنے والد کی طوطوں میں دل چسپی دیکھ کر بہت خوش ہوا اور بولا:

”یہ لڑتے ہیں، اس لیے ہم نے انہیں الگ کر دیا ہے۔ الگ نسلوں کے طوطے ہیں نا اس لیے......“

”ارے اس سے کیا فرق پڑتا ہے......“ فہیم صدیقی بے ساختہ بولے: ”طوطے تو طوطے ہوتے ہیں...... بھلا یہ اپنے ہم جنسوں کو گوارا کیوں نہیں کرتے......!“

”ہم کئی بار یہ دیکھ چکے ہیں......“ ندیم بولا: ”ایک بار غلطی سے مٹھو پنجرے میں چلا گیا تو سب طوطے اس پر پل پڑے تھے۔ کچھ دن پہلے ہم ایک پٹھا لائے تھے، ان چھوٹے طوطوں نے اُسے بھی نہیں بخشا۔ ہم بیچارے کو زخمی حالت میں بدری نارائن کو دے آئے کہ مرہم پٹی کر کے اسے آزاد کر دیں۔ آپ یقین کریں یہ اپنے جیسے طوطوں کو بھی نہیں بخشتے......! کل سکندر آیا تھا، وہ کہہ رہا تھا کہ جب یہ طوطے ایک ساتھ نہیں رہ سکتے تو ہم ہندوستانی ایک ساتھ کیسے رہ سکتے ہیں......؟“

فہیم صدیقی نے محسوس کیا کہ وہ کچھ بدمزہ ہو رہے ہیں۔ وہ نیچے آگئے۔ رات جب وہ اپنے بستر پر کروٹیں لے رہے تھے تو اطلاع ملی کہ مسٹر جناح نے انگریز سرکار کا محدود آزادی کا مجوزہ منصوبہ تسلیم کر لیا ہے، جسے مطالبۂ پاکستان سے مکمل انحراف قرار دیا جارہا تھا۔

وہ ۱۹۴۶ء کا پُر آشوب اور ہنگامہ پرور سال تھا۔ ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہوا ہی چاہتا تھا۔ حالیہ انتخابات نے ہندوستانیوں کی سوچ فکر اور پسند کی عکاسی کردی تھی اور حکومت برطانیہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوگئی تھی کہ ہندوستان کا تصفیہ مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان ہی ہوگا۔ مسلم لیگ کسی بھی طور پر مطالبۂ پاکستان سے دستبردار ہونے کو تیار نہ تھی لیکن اب مسٹر جناح نے ایک ایسے منصوبے کو قبول کر لیا تھا جس سے پاکستان کے مطالبے کی نفی ہوتی تھی۔

اگلی صبح فہیم صدیقی کی طبیعت کچھ ناساز تھی مگر وہ اٹھے اور باہر نکل آئے۔ ہندو اور کانگریس نواز اخبارات نے اس واقعے کو مسلمان کی شکست اور مطالبۂ پاکستان کے خاتمے سے تعبیر کیا تھا۔ مسلمان اخبارات کا رویہ محتاط تھا۔ مسلمانوں کو اپنے قائد پر پورا بھروسا تھا مگر یہ بات ایسی تھی کہ ان کے ایمان ڈول رہے تھے۔ کچھ لوگ پوچھتے تھے کہ ہم سے چاندی کی گولیاں مانگنے والا سپہ سالار بغیر لڑے پسپائی پر کیوں تیار ہو گیا ہے۔

پھر ہر آنے والا دن ایک نئی خبر سناتا گیا۔ ہندوستان کو متحد رکھنے کے لیے آخری کوشش کے طور پر عبوری حکومت قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ مگر بعد ازاں یہ عبوری حکومت کانگریس کی غلط پالیسیوں اور مسلمانوں کو زیر تسلط رکھنے کی منصوبہ بندی کی وجہ سے ناکامی سے دوچار ہوئی۔

اب سب کی آنکھیں کھل چکی تھیں۔ قائداعظم نے اپنی بہترین حکمت عملی سے ثابت کر دکھایا تھا کہ ہندوستان کی تقسیم کی ذمے دار کانگریس ہے اور انگریز حکومت کے کانگریس کی طرف جھکاؤ اور اپنی سیاسی قوت کے بھرپور اظہار کے لئے مسلم لیگ نے یومِ راست منایا تو ہندوستان کے طول وعرض میں مسلمانوں کا اجتماعی اور متفقہ مطالبہ پاکستان پوری قوت اور شدت سے دہرایا گیا۔ مسلمانوں کی اجتماعی سوچ اس قدر واضح

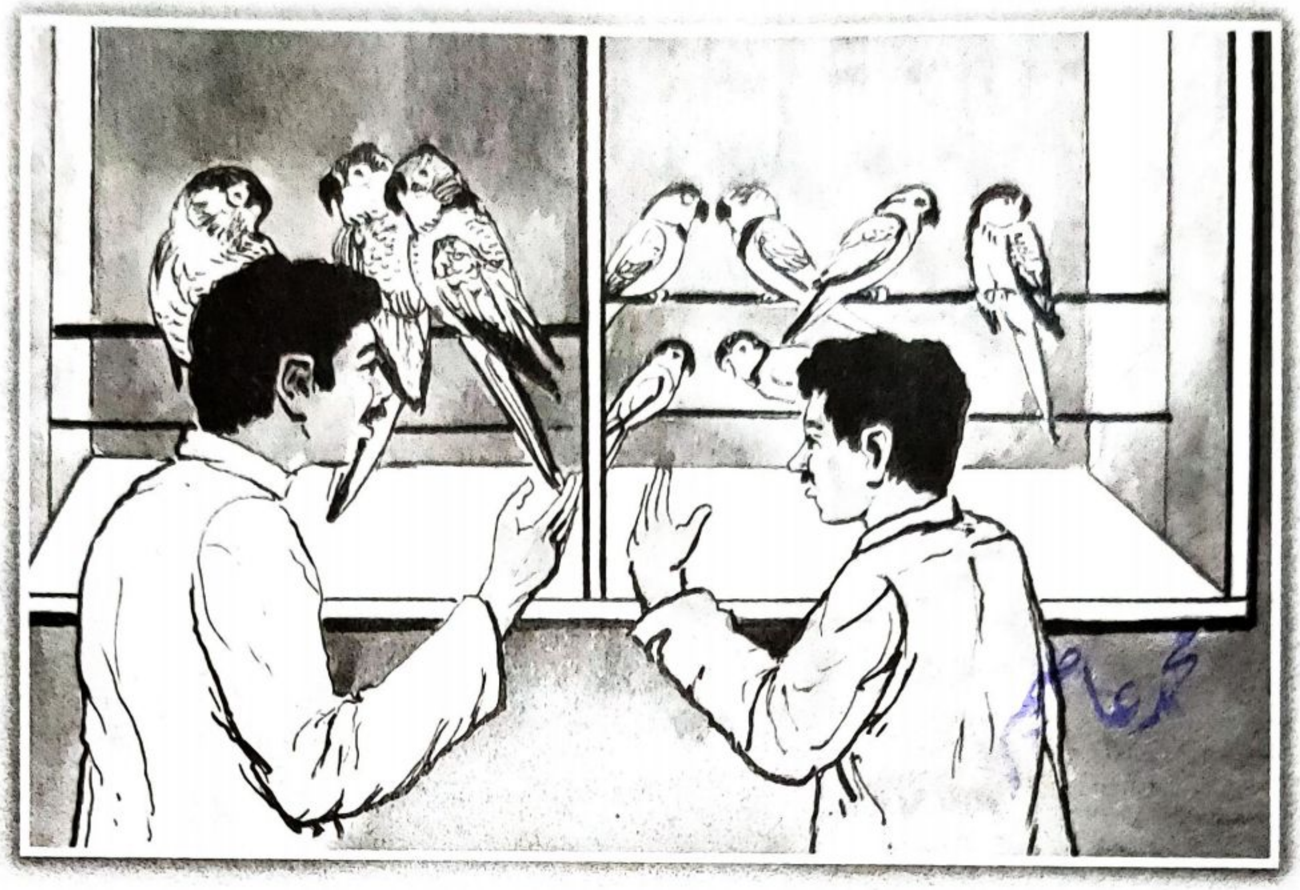

اور ایک ہو چکی تھی کہ کانگریسی مسلم کارکن اور رہنما منہ چھپانے پر مجبور ہو گئے تھے۔

فہیم صدیقی اب زیادہ وقت گھر پر گزارنے لگے۔ وہ خود کو بہت تنہا محسوس کر رہے تھے۔ وہ چھت پر آئے تو انہیں مٹھو بھی اپنی طرح تنہا اور اداس لگا۔ اُس وقت ندیم پانی کی بالٹی لیے چھت پر چلا آیا۔ اپنے والد کو دیکھ کر وہ خوش ہو گیا اور بولا:

”ابا جان! ہم نے منت مانگی ہے کہ پاکستان بن گیا تو ہم سب طوطوں کو آزاد کر دیں گے تاکہ یہ سب بھی ہماری طرح اپنی آزادی منائیں۔“

”کیا یہ آزاد فضاؤں میں بھی لڑتے ہیں؟“ فہیم صدیقی نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

ندیم مسکرا کر بولا:

”نہیں ابا جان! قید کا غم ان کو آپس میں لڑاتا ہے۔ جیسے ہم ہندو مسلم لڑتے ہیں کیوں کہ ہم سب بھی قیدی ہیں۔ پھر جب ہم آزاد ہو جائیں گے تو ہمارے آپس کے جھگڑے بھی ختم ہو جائیں گے۔ ان آزاد طوطوں کی طرح ہم بھی ہنسی خوشی رہیں گے......!“

فہیم صدیقی نے محبت بھری نظروں سے اپنے ہونہار بیٹے کو دیکھا۔ انہیں محسوس ہوا کہ وہ جس الجھن اور پریشانی کا شکار تھے اُس کا حل اُن کے بیٹے نے بتا دیا ہے۔ واقعی سب جھگڑے غلامی کے تھے۔ انہوں نے ایک نظر آسمان پر اڑتے پرندوں پر ڈالی پھر پنجرے میں قید طوطوں کی طرف دیکھا، چند لمحوں بعد وہ ایک سرد آہ بھر کر بولے:

”تم بالکل ٹھیک کہتے ہو میرے بیٹے! تم نے مجھے آزادی اور غلامی کا جو سبق پڑھایا ہے، وہ مجھے کسی کتاب کسی استاد نے نہیں سکھایا...... آؤ ان طوطوں کو ابھی سے آزاد کر دیں تاکہ خدا ہمارے وطن کی آزادی کو بھی قریب تر کر دے۔“

ندیم بُری طرح چونکا...... اس نے دیکھا کہ آج اس کے والد کے چہرے پر اطمینان تھا اور وہ چھت پر لگے سبز پرچم کو محبت بھری نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ ندیم نے اپنے اندر خوشی کے سوتے پھوٹتے ہوئے محسوس کیے اور پنجرے کا دروازہ کھول دیا...... دُوسرے لمحے ایک ایک کر کے طوطے باہر نکلنے لگے اور آزاد فضاؤں میں گم ہو گئے۔ مٹھو بھی سامنے دیوار پر جا بیٹھا تھا اور اپنی اداسی بھول کر خوشی سے ندیم کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ڈاکٹر طارق ریاض خان (لاہور)

قرآن مجید

قرآن مجید دُنیا میں سب سے زیادہ پڑھی، سمجھی اور عمل کی جانے والی مذہبی کتاب ہے۔ یہ الہامی کتاب ہے جس کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ یہ فرشتوں کے سردار حضرت جبرائیلؑ کے ذریعے امام الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر تقریباً 22 سال 5 ماہ اور 14 دن میں نازل ہوئی۔ قرآن کے لغوی معنی ہیں

"پڑھا ہوا" جب کہ اس کتاب کا موضوع "انسان" ہے۔ قرآن مجید کے کُل 30 پارے اور سورتوں کی تعداد 114 ہے۔ اس کی کُل 7 منزلیں اور کُل رکوع 557 ہیں۔ اس عظیم کتاب میں 14 حروف مقطعات ہیں۔ قرآن حکیم کی سب سے طویل سورت "سورۃ البقرہ" اور مختصر ترین سورت مبارکہ "سورۃ الکوثر" ہے۔ لفظ سورۃ (سورت) کے لغوی معنی ہیں "فصیل یا شہر پناہ" جب کہ آیت کے لغوی معنی ہیں "نشانی"۔ قرآن وحی کی شکل میں نازل ہوا اس کے پہلے کاتب حضرت خالد بن سعیدؓ اور آخری وحی کے کاتب حضرت ابی بن کعبؓ تھے۔ حجاج بن یوسف نے قرآن پاک کو اعراب لگوائے تھے۔

طوطے

لفظ طوطا پڑھتے اور سنتے ہی فوراً سبز سے رنگ کے پرندے کا تصور ابھرتا ہے۔ طوطوں کی 372 اقسام (Species) دریافت ہو چکی ہیں۔ ان کی زیادہ تر انواع آسٹریلیا اور امریکہ کے جنگلات میں ملتی ہیں۔ کوے کے بعد ان کا شمار ذہین ترین پرندوں میں ہوتا ہے۔ یہ بیج، نٹ (Nut)، پھل اور پودوں کے دُوسرے حصے بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ ان کے جبڑے چونچ کی شکل میں پائے جاتے ہیں جو سخت اشیاء کو بھی کتر ڈالتے ہیں۔ ایک طوطے کا اوسط وزن 10 گرام سے لے کر 4 کلوگرام تک ہو سکتا ہے۔ ان کا رنگ سبز، سفید، پیلا، نیلا، گلابی، سرخ اور ملا جلا بھی ہو سکتا ہے۔ ان کے انڈوں سے 17 سے 35 دن کے اندر بچے نکل آتے ہیں۔ طوطوں کی 19

اقسام دُنیا سے ناپید ہو چکی ہیں جب کہ ان کی 130 اقسام ناپید ہونے کے قریب ہیں۔

انگور

گرمیوں میں آم کے بعد سب سے زیادہ کھایا اور پسند کیا جانے والا پھل انگور ہے۔ جسے ہر عمر کے لوگ کھا سکتے ہیں انگور کا سائنسی نام "Vitis Vinifera" ہے۔ یہ سدا بہار پودا ہے جس کا پھل جام، جیلی، سرکہ، ادویات اور بیکری کی مصنوعات کی تیاری میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کا آبائی گھر ترکی

ہے، جہاں کے لوگوں نے سب سے پہلے اس کی باضابطہ کاشت شروع کی تھی۔ انگور کا پھل گچھے کی شکل میں ہوتا ہے جس میں 6 سے 300 تک دانے لگے ہوتے ہیں۔ انگوروں کا رنگ کریمی، سیاہ، گہرا نیلا، سبز، پیلا، گلابی اور سفید ہوتا ہے۔

اقوام متحدہ کے ادارے FAO کے مطابق دُنیا کے دس بڑے انگور پیدا کرنے والے ممالک درج ذیل ہیں۔ (نوٹ یہ فہرست سال 2009ء میں پیش کی گئی تھی)

چین، امریکہ، فرانس، اسپین، ترکی، ایران، الجیریا، چلی، بھارت، اٹلی۔

100 گرام انگور میں 18 گرام کاربوہائیڈریٹس 0.72 گرام پروٹین، 0.16 گرام چکنائیاں (FATS) کے علاوہ وٹامن E,C,B,A اور K پائی جاتی ہیں۔ انگور کئی نمکیات کا بھی خزانہ ہیں جیسے سوڈیم، پوٹاشیم، کیلشیم، کاپر، میگنشیم، میگنیز اور زنک وغیرہ۔ یہ تمام وٹامنز اور نمکیات اچھی صحت کے لیے نہایت اہم ہیں۔

بادل

بادل کا نام سنتے ہی زوردار گھن گرج اور موسلادھار بارش کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے۔ سورج کی جھلس دینے والی تپش کو صرف بادل ہی روک سکتے ہیں۔ گویا خلق خدا کے لیے رُب العزت کا یہ بہت بڑا تحفہ ہے۔ سائنسی اعتبار سے بادل پانی کے قطروں کا ایسا مجموعہ ہے جو ظاہری طور پر بوندوں یا جمے ہوئے کرسٹل (Crystal) پر مشتمل ہوتے ہیں۔ یہ فضا میں معلق رہتے ہیں۔ بادلوں کی کئی اقسام ہیں۔ انہیں ان کی بلندی کے اعتبار سے تقسیم کیا گیا ہے۔ فیملی اے (Family A) میں وہ بادل شامل ہیں جن کی زمین سے بلندی 10,000 سے 25000 فٹ تک ہوتی ہے۔ قطبی علاقوں میں ان کی بلندی 16500 سے 25000 فٹ ہوتی ہے۔ فیملی بی میں ایسے بادل شامل ہیں

جو 6500 سے 13000 فٹ کی بلندی پر ہوتے ہیں۔ انہیں مڈل بادل (Middle clouds) بھی کہا جاتا ہے۔ فیملی سی کے بادل 6500 یا اس سے کم بلندی پر ہوتے ہیں۔ بادلوں کی ایک اور فیملی ڈی ہے جو مختلف بلندیوں پر پائی جاتی ہے

بادلوں کا رنگ بھی مختلف ہوتا ہے۔ یہ سبز، سفید، گرے، گرے گرین، پیلے، نیلے، سرخ، اورنج اور گلابی رنگ کے ہوتے ہیں۔ ان کی رنگت کا انحصار سورج کی روشنی پر ہے۔ پاکستان میں بارشوں کا سبب بننے والے سب سے اہم بادل مون سون کے موسم میں آتے ہیں۔

مختصر معلومات

☆ مسجدوں کا شہر ڈھاکہ کو کہا جاتا ہے۔
☆ دریاؤں کا ملک بنگلہ دیش کو کہتے ہیں۔
☆ دُنیا میں سب سے زیادہ گاڑیاں جاپان میں بنتی ہیں۔
☆ دُنیا کا سب سے بڑا صنعتی شہر شنگھائی ہے۔
☆ دُنیا کا سب سے بڑا جزیرہ گرین لینڈ ہے۔
☆ دُنیا میں سب سے زیادہ گنا کیوبا میں پایا جاتا ہے۔
☆ دُنیا کا سب سے بڑا گھنٹہ گھر بگ بین ہے جو لندن میں واقع ہے۔
☆ تبت کو دُنیا کی چھت کہا جاتا ہے۔

(دامن زہرا، اسلام آباد)

سیاچن گلیشیئر

معاذ فاروق (جلال پور جٹاں)

سیاچن بلتی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں جنگلی گلاب، بلتستان پاکستان کا حصہ ہے اور سیاچن کے اردگرد آباد لوگوں کی زبان بلتی ہے۔ اس علاقے میں پاکستانی کرنسی چلتی ہے سیاچن پاکستان کا دُوسرا بڑا ہے۔ سیاچن سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ یہاں سردی میں درجۂ حرارت منفی تیس سے منفی پچاس ڈگری تک رہتا ہے۔ سخت گرمی کے موسم میں بھی یہاں کی سردی برداشت نہیں ہوتی۔ سیاچن گلیشیئر کو سب سے پہلے ڈاکٹر سیف لانگ نے دریافت کیا۔ ساری دُنیا میں سیاچن گلیشیئر کو پاکستان کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے دُنیا بھر کی جتنی بھی کوہ پیما جماعتیں اس علاقے کی چوٹیاں سر کرنے کے لیے آتی ہیں تو وہ حکومتِ پاکستان سے ہی اجازت لیتی ہیں۔ پاکستان اور بھارت میں اقوام متحدہ کے سلامتی کونسل کے نمائندے کی رپورٹ کے مطابق بھی سیاچن گلیشیئر پاکستان کا ہی حصہ ہے۔ سیاچن گلیشیئر کشمیر کی طرف سے سولہ سے بائیس ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔

پاکستان کی طرف سے سیاچن گلیشیئر تک جانے کے لیے گلگت سے اسکردو اور پھر اسکردو سے آگے ڈم سم کا میدانی علاقہ آتا ہے۔ یہاں سے سیاچن گلیشیئر اٹھارہ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ ڈم سم سے آگے گوما کا علاقہ آتا ہے پھر درہ سالتورہ پھر درہ بیلا فونڈا اس کے بعد درہ گیانگ سے ہوتے ہوئے سیاچن تک جایا جاتا ہے، لیکن سیاچن پر پہنچنا اتنا آسان نہیں ہے۔ یہاں پر انسانی ہمت جواب دے جاتی ہے۔ ٹھنڈی اور یخ بستہ ہواؤں میں چلنا اتنا دشوار ہوتا ہے کہ یہ سفر کئی دن اور کئی راتوں پر محیط ہو جاتا ہے یہاں پر عام دنوں میں درجۂ حرارت منفی پچیس سنٹی گریڈ سے بھی کم ہو جاتا ہے اور پھر رات کے وقت تو اور بھی بہت کم ہو جاتا ہے۔ اس علاقے میں سیدھی اور سپاٹ چڑھائیاں برف سے اٹی پڑی ہیں اور چلتے ہوئے پاؤں زمین پر نہیں ہوتے بلکہ برف میں دھنس جاتے ہیں۔ یہاں پر آکسیجن کی بے حد کمی ہوتی ہے جس کی وجہ سے سانس لینے میں دشواری پیش آتی ہے۔ یہاں پر بعض اوقات سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے برفانی طوفان بھی چلتے رہتے ہیں۔ اس علاقے میں ہیلی کاپٹر کو اتارنے کے بعد اس کا انجن بند نہیں کیا جاتا، اس لیے کہ یہاں پر آکسیجن کی کمی کی وجہ سے اسے اسٹارٹ ہی رکھا جاتا ہے اگر انجن بند کر دیا جائے تو پھر ڈر ہوتا ہے کہ کہیں دوبارہ انجن اسٹارٹ ہی نہ ہو۔ سیاچن کے محاذ پر فوجیوں کے لیے فائبر گلاس کے چھوٹے چھوٹے خیمے نصب ہیں اس جگہ

ایک فوجی جوان کو جو وردی پہننے کے لیے دی جاتی ہے۔ اُس کی قیمت چار ہزار ڈالر ہوتی ہے۔ فوجیوں کے جوتے بھی خاص قسم کے ہوتے ہیں۔ جو کہ امریکہ سے منگوائے جاتے ہیں ایک جوڑے کی قیمت آٹھ ہزار روپے ہوتی ہے۔

فوجی وردی مشکل سے چھ ماہ چلتی ہے۔ فائبر گلاس کے خیموں میں مسلسل مٹی کے تیل کا چولہا جلتا رہتا ہے اگر یہ تمام احتیاطی تدابیر نہ کی جائیں تو سیاچن پر انسان کا زندہ رہنا ناممکن ہو جائے۔ یہاں پر فوج نے آپس میں رابطے کے لیے ٹیلی فون لائنیں بچھائی ہوئی ہیں جو کئی کئی فٹ برف کاٹ کر بچھائی گئی ہیں۔

سیاچن گلیشیئر کی لمبائی 75 کلومیٹر سے زائد اور چوڑائی پانچ کلومیٹر ہے۔ سیاچن گلیشیئر سے کے ٹو کو بھی راستہ جاتا ہے سیاچن گلیشیئر میں اتنی سردی ہوتی ہے کہ اگر ہاتھ بغیر دستانے کے کسی چیز سے لگ جائے تو ہاتھ کا دورانِ خون رک جاتا ہے یوں لگتا ہے جیسے خون جم گیا ہو اور ہاتھ سن ہو جاتا ہے اس کیفیت کو سنو بائٹ کہتے ہیں، ایسی صورت میں ہاتھ بے کار ہو جاتا ہے اور آخر کار اسے کاٹنا پڑتا ہے۔

سیاچن گلیشیئر تک پہنچنے کے لیے دو راستے ہیں ایک راستہ تو وہ ہے جو اسکردو سے ہو کر جاتا ہے اور دُوسرا لواخ سے جاتا ہے۔ پاکستان اور چین کی سرحد پر واقع "درہ کرتی" سیاچن گلیشیئر کا منبع ہے۔ ۱۹۷۸ء سے قبل سیاچن کی کوئی سیاسی اور فوجی اہمیت نہیں تھی مگر شاہراہِ قراقرم کی تعمیر مکمل ہونے کے چند ماہ بعد اس علاقے میں بھارت نے اپنی نظریں لگانا شروع کر دی تھیں۔ ۱۹۸۳ء میں بھارت نے سیاچن کا جائزہ لینے کے لیے خفیہ طور پر ایک فوجی دستہ اس علاقے میں بھیجا تھا اس کے بعد ۱۹۸۴ء میں بھارت نے اچانک اس گلیشیئر پر اپنی فوجی چوکیاں قائم کر لیں چونکہ یہ علاقہ غیر آباد ہے اور انتہائی بلندی پر ہونے کی وجہ سے یہاں آمدورفت بھی نہیں ہے۔ اس لیے پاکستان کو بروقت اس کی خبر نہ ہوئی، پھر ایک دن پاکستانی کوہ پیما محمد حفیظ نے اس علاقے میں بھارتی فوجیوں کو کیمپ لگائے دیکھا تو واپس آکر بھارتی فوجیوں کی موجودگی کی اطلاع دی۔ جس پر پاکستانی آرمی نے فوری کارروائی کی اور سیاچن پر باقاعدہ لڑائی کا آغاز ہو گیا۔ بھارت کی پانچ چوکیوں میں سے تین پاکستانی نوجوانوں نے چھین لی ہیں۔ یہ دُنیا کا بلند ترین محاذِ جنگ ہے یہاں پر جہاں انسان کو انسان سے لڑنا پڑتا ہے۔ وہاں موسم کا بھی ڈٹ کر مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اس علاقے میں ایک ہیلی کاپٹر پر ایک گھنٹے کا خرچ چالیس ہزار روپے ہوتا ہے سیاچن کے محاذ پر متعین اکثر فوجی جوانوں کو شدید قسم کے امراض لاحق ہو جاتے ہیں جن میں، پلمونری، ڈیمہ اور برین اوڈیم کے حملے شامل ہیں، ان امراض سے جسم مفلوج ہو جاتا ہے۔

ہمارا پرچم یہ پیارا پرچم

محمد خلیل چودھری (دینہ)

☆ ہر ملک کا قومی پرچم اس ملک کی شناخت اور آزادی کی پہچان سمجھا جاتا ہے۔ پاکستان کا خوب صورت سبز ہلالی پرچم بھی اس کی شناخت اور پہچان ہے۔ یہ پرچم 11 اگست 1947ء کو منظور کیا گیا تھا۔

☆ اس پرچم کی تاریخ 30 دسمبر 1906ء سے شروع ہوتی ہے۔ جب ڈھاکہ میں مسلمانانِ ہند کی ایک سیاسی تنظیم آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی اور ایک سبز پرچم جس پر چاند اور ستارہ بنا ہوا تھا۔ اس تنظیم کا پرچم قرار پایا تھا۔

☆ 3 جون 1947ء کو جب ہندوستان کی تقسیم کا اعلان ہوا تو قائد اعظم محمد علی جناحؒ نے پاکستان کے قومی پرچم کے لئے رفقائے کار سے مشورہ کرنا شروع کیا۔ اُدھر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے قائد اعظمؒ سے اصرار کیا کہ وہ دیگر برطانوی نو آبادیوں کی طرح پاکستان کے پرچم میں پانچواں حصہ یونین جیک کے لئے مخصوص کر دیں۔ مگر قائد اعظم نے اس طوقِ غلامی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اپنے ساتھیوں کے سامنے مسلم لیگ کے پرچم کو پاکستان کا قومی پرچم بنانے کے تجویز پیش کی۔

☆ پاکستان کا قومی پرچم گہرے سبز رنگ کا ہے۔ اس پر ایک طرف سفید عمودی پٹی اور درمیان میں ایک ہلال ہے۔ جس کے اُوپر پانچ کونوں والا ستارہ بنا ہوا ہے۔

☆ یہ پرچم سبز اور سفید کپڑے کا ایک مستطیل ٹکڑا ہے۔ جس کی لمبائی اور چوڑائی کا تناسب 2x3 ہے۔ سفید پٹی کی چوڑائی پرچم کی لمبائی کے ایک چوتھائی کے برابر ہے یہ اور اقلیتوں کی نمائندگی کرتی ہے۔

☆ قومی پرچم کا انتخاب 11اگست1947ء کو پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کے اجلاس میں ہوا۔ وزیر اعظم لیاقت علی خان نے اسمبلی میں دو پرچم قائد اعظم کو پیش کیے تا کہ وہ پرچم کی منظوری دے دیں۔ قائد اعظم نے اجلاس کی صدارت کی۔ انہوں نے اِن میں سے ایک پرچم منظور کیا۔

☆ قائد اعظم نے نئے پرچم کی ڈیزائنگ کا کام پاکستان بحریہ کے سپرد کیا۔ اور کئی ڈیزائن بننے کے بعد وہ ڈیزائن منظور کیا گیا جو آج ہمارے قومی پرچم کا ڈیزائن ہے۔

☆ 14 اگست 1947ء کو جب دُنیا کے نقشے پر پاکستان کا اضافہ ہوا تو دارالحکومت کراچی میں یہ پرچم لہرانے کا اعزاز مولانا شبیر احمد عثمانی نے اور ڈھاکہ میں یہ پرچم لہرانے کا اعزاز مولانا ظفر احمد عثمانی نے حاصل کیا اور یوں دُنیا کے پرچموں میں ایک خوب صورت پرچم کا اضافہ ہو گیا۔

☆ پاکستان کا قومی پرچم آزادی کے بعد سب سے پہلے فرانس میں لہرایا گیا۔ پرچم لہرانے کا اعزاز اسکواڈرن لیڈر سرفراز احمد رفیق کو حاصل ہوا تھا۔ پاک فضائیہ کے یہ سپوت 1965ء میں شہید ہوئے اور ہلالِ جرأت کا تمغہ حاصل کیا۔

☆ قومی پرچم مذہبی اور قومی تقریبات مثلاً یومِ آزادی، یومِ جمہوریہ، یومِ ولادت قائد اعظمؒ اور عید میلاد النبیؐ کے موقعوں پر لہرایا جاتا ہے۔ ملکی اور غیر ملکی شخصیات کی وفات پر

اسے سرنگوں کر دیا جاتا ہے۔

☆ سفید رنگ اقلیتوں کی اور سبز رنگ اسلام کی نمائندگی کرتا ہے۔ سبز رنگ کے حصے پر ایک ہلال اور ایک ستارہ بنا ہوا ہے۔ یہ ہلال 45 درجے کے زاویے پر جھکا ہوا ہے۔

☆ پاکستان میں قومی پرچم قائداعظمؒ اور لیاقت علی خان کی برسیوں کے موقعوں 11 ستمبر اور 16 اکتوبر کو سرنگوں کیا جاتا ہے۔

☆ فیکٹریوں میں قومی پرچم کو سلامی دینے کے بعد کام شروع کرنے کا فیصلہ 9 مارچ 1975ء کو کیا گیا تھا۔

☆ امریکہ کے خلائی جہاز اپالو نمبر 11 میں چاند پر جو پاکستانی پرچم بھیجا گیا تھا وہ اب کراچی کے قومی عجائب گھر میں ہے۔

☆ جو قومی پرچم جون 1947ء میں دو بھائیوں ماسٹر افضال حسین اور الطاف حسین نے دہلی میں تیار کیا تھا۔ ان میں سے ماسٹر افضال حسین جو 1897ء میں پیدا ہوئے تھے اور انہوں نے تحریکِ پاکستان میں حصہ لیا تھا۔ انہوں نے پاکستان کا پہلا پرچم تیار کرنے کا اعزاز حاصل کیا تھا۔ جنرل ضیاء الحق نے انہیں 8 مئی 1979ء کو کراچی میں پانچ ہزار روپے کا عطیہ دیا تھا۔

☆ صدرِ مملکت جنرل محمد ضیاء الحق کی جانب سے ماسٹر افضال حسین کو 1987ء میں تمغہ ءحسن کارکردگی کا صدارتی ایوارڈ دیئے جانے کی باضابطہ اطلاع دی گئی لیکن وہ اسے حاصل کرنے سے پہلے ہی انتقال کر گئے۔ وہ ڈیڑھ سال تک ہڈی کے سرطان میں مبتلا رہے۔ صدرِ مملکت کے حکم پر ''الشفاء'' میں انہیں داخل کرایا گیا۔ افضال حسین نے 10 جولائی 1987ء کو وفات پائی۔

☆ پاکستان کے اُس قلعہ کا نام قلعہ روہتاس ہے۔ جس پر دو سو سال کے بعد اسلامی پرچم 22 مئی 1970ء کو لہرایا گیا۔ یہ قلعہ شیر شاہ سوری نے 1544ء میں بنوایا تھا اور یہ دینہ سے 7 کلو میٹر جنوب کی طرف واقع ہے۔

بلا عنوان کے کچھ اچھے عنوانات

☆ ارے میاں! کیا صرف چائے پر ہی ٹرخادو گے؟ (حمزہ کامران، لاہور)

☆ واہ بھئی واہ! چائے کا مزہ تو اب آئے گا۔ (طہٰ یاسین، حیدر آباد)

☆ تازہ ترین خبریں، گرماگرم چائے۔ (داؤد علی خان، صوابی)

☆ خبروں کی طرح چائے بھی گرم لگتی ہے۔ (اسرار لودھی، اوکاڑہ)

☆ ٹیکس برائے ٹی وی۔ (علیشبہ رحمان، لاہور)

☆ کبھی یوں بھی ہو گا۔ (قرشیہ فاطمہ فاروقی، رحیم یار خان)

☆ گرماگرم چائے پی کے گرماگرم خبریں سنائیں۔ (زارا شاہ، لاہور)

☆ محوِ حیرت ہوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی۔ (سیدہ پائندہ حیا، ساہی وال)

☆ خبریں چھوڑو، چائے پکڑو۔ (آمنہ علی، جہلم)

☆ گرماگرم خبروں کے ساتھ گرماگرم چائے پینے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ (عبدالصمد قریشی، بہاول پور)

☆ یہی تو ہے وہ اپنا پن۔ (سیدہ منقبت ایلیا، ساہی وال)

☆ چائے چاہیے، کون سی جناب؟ (اویس شوکت، فیصل آباد)

☆ چائے تیری مرضی کی، پر خبریں میری مرضی کی۔ (ربیعہ سعادت، اسلام آباد)

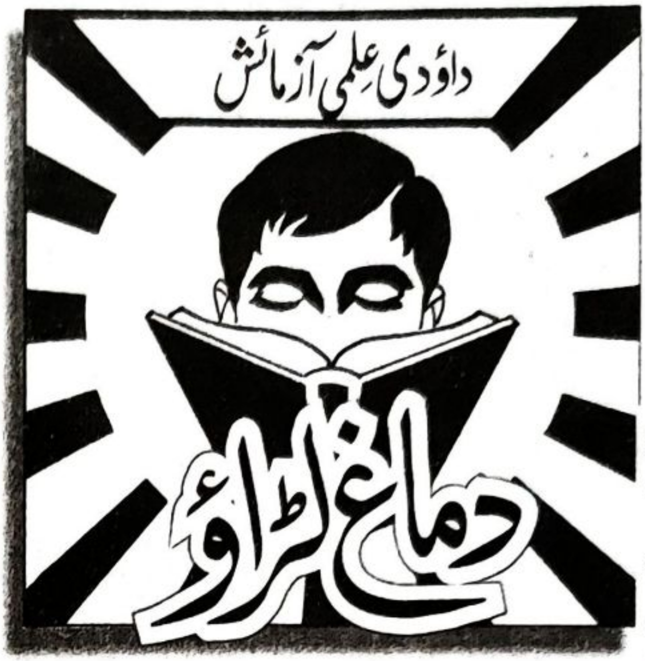

درج ذیل دیے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم کون تھے؟
i۔ خواجہ ناظم الدین ii۔ نواب زادہ لیاقت علی خان iii۔ چوہدری محمد علی

2۔ کے ٹو کو مقامی زبان میں کیا کہا جاتا ہے؟
i۔ پامیر ii۔ اپاسنگ iii۔ چوگوری

3۔ پاکستان رقبے کے اعتبار سے دُنیا میں کس نمبر پر آتا ہے
i۔30 ویں نمبر پر ii۔ 50 ویں نمبر پر iii۔33 ویں نمبر پر

4۔ پاکستان کے پہلے چیف جسٹس کون تھے؟
i۔ سید امیر علی ii۔ میاں عبد الرشید iii۔ میاں فلک شیر

5۔ پاکستان کا کون سا شہر سوتی کپڑے کی صنعت کے حوالے سے مشہور ہے؟
i۔ کراچی ii۔ لاہور iii۔ فیصل آباد

6۔ پاکستان کا سوئٹزر لینڈ کس شہر کو کہا جاتا ہے؟
i۔ سوات ii۔ کالام iii۔ مالم جبہ

7۔ پاکستان کے پہلے موسمیاتی راکٹ کا نام کیا تھا؟
i۔ بدر اوّل ii۔ غزنوی اوّل iii۔ رہبر اوّل

8۔ قصہ خوانی بازار پاکستان کے کس شہر میں واقع ہے؟
i۔ سکھر ii۔ پشاور iii۔ کوئٹہ

9۔ منگلا ڈیم کس سن میں تعمیر کیا گیا تھا؟
i۔ 1969ء ii۔ 1966ء iii۔ 1967ء

10۔ "پاکستان کا مطلب کیا، لاالہ الا اللہ" یہ نعرہ کس کی تخلیق ہے؟
i۔ اصغر سودائی ii۔ میاں بشیر احمد iii۔ چوہدری رحمت علی

جوابات علمی آزمائش جولائی 2010ء

1۔ نماز 2۔ حضرت عائشہؓ 3۔ حضرت حمزہؓ 4۔ روزہ 5۔ طاعون 6۔ 1/16 سیکنڈ 7۔ ہیمو گلوبن 8۔ چیچنا 9۔ ٹیکسلا۔ 10۔ نظیر اکبر آبادی

اِس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جا رہے ہیں۔

☆ بنت محمد طارق عبدالباری، کراچی (200 روپے کی کتب)
☆ طوبیٰ امتیاز، اسلام آباد (175 روپے کی کتب)
☆ عثمان علی رانجھا، میاں والی (125 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی:
☆☆ غازی خان، حافظ حامد ضیاء، ماہا علی، صباء شاہد، محمد آدم اشفاق، کاشان احمد، عنبر عابد، محمد ذیشان ارشد، عسال طاہر، ثمن فاطمہ، مریم ندیم صدیقی (لاہور)۔ قمر ناز دہلوی، محمد عمر اقبال، فرح اسلام، تماضر خنسا (کراچی)۔ اویس شوکت، عبیر صالحہ (فیصل آباد)۔ رمشہ زاہد خان۔ مروہ شاہد، محمد زین اشرف (سیال کوٹ)۔ محمد سرمد اسلام، عائشہ منور، قدسیہ مبین، عزین رحمان، رزان عائشہ، عطاء المنعم، دامنِ زہرا (اسلام آباد)۔ محمد ذیشان قمر، معین اکرم، اسامہ افتخار راجہ، عروسہ عارف، ماریہ طارق، محمد سعد اعوان، رابعہ آصف، نوشابہ غفار (راول پنڈی)۔ طہٰ یاسین (حیدر آباد)۔ داؤد علی، احسن آیاز فانی (صوابی)۔ محمد اکبر جاوید، محمد ریحان صفدر (ڈیرہ غازی خان)۔ غلام صابر (اوکاڑا)۔ راحت اسلم (گوجرانوالہ)۔ محمد سرمد۔ (چکوال)۔ حمزہ غفور، محمد علی (ملتان)۔ رانا میرب فاروق (ڈسکہ)۔ سیدہ منقبت ایلیا (ساہی وال)۔ مدثرہ خلیل (دینہ)۔ فائزہ شکیل (وزیر آباد)۔ محمد مشہود اسحاق (اٹک)۔ کشف قریشی (بہاول پور)۔ محمد ہاشم (میاں والی)۔ سیدہ ماہم گفتار شاہ، مغاذ بن مقصود (واہ کینٹ)۔ ہارون الرشید (جہلم)۔ محمد عتیق الرحمان (آزاد کشمیر)۔ محمد آصف روانہ، طلحہ سلیم (سرگودھا)۔ کمیل علی خان (جھنگ)۔ مدثر احمد طاہر (چناب نگر)۔ جنید نعیم دیوان (حویلی لکھا)۔ محمد بلال سانول (خوشاب)۔ محمد علی فاروقی (رحیم یار خان)۔ محمد علی۔ عاقب سفیان (بھکر)۔ ☆☆

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 اگست 2010ء

دماغ لڑاؤ

نام: ____________

مقام: ____________

پتا: ____________

____

صُلح صفائی

کلیم چغتائی (کراچی)

آج پھر لڑائی ہو رہی تھی۔

مسئلہ کچھ بھی نہ تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ سعدیہ نے راشدہ کے موزے پہن لیے تھے۔ سعدیہ کا بھی قصور نہیں تھا۔ موزے دونوں بہنوں کے تقریباً ایک ہی جیسے تھے۔ امی نے راشدہ کے موزے دھو کر سوکھنے کے بعد اٹھا کر غلطی سے سعدیہ کے بستر پر رکھ دیے تھے۔ راشدہ کہہ رہی تھی:

”تم نے جان بوجھ کر میرے موزے پہنے ہیں تاکہ مجھے پرانے موزے پہن کر اسکول جانا پڑے اور میری سہیلیاں میرا مذاق اڑائیں۔“

”اگر یہ تمہارے موزے ہیں تو میرے بستر پر کیسے آئے؟“ سعدیہ نے دلیل دی۔

”موزے کی آنکھیں نہیں ہوتیں، نہ ان کے ہاتھ پاؤں ہوتے ہیں۔ تم نے ہی چپکے سے میرے موزے اٹھا لیے ہوں گے۔“ راشدہ نے تیز لہجے میں کہا۔

”موزے کی آنکھیں نہ سہی، تمہاری تو ہیں، تم اپنے موزے سنبھال کر کیوں نہیں رکھتی ہو؟“ سعدیہ نے فوراً جواب دیا۔

”اب اگر تم نے میرے موزے پہنے تو میں تمہارا دوپٹا اٹھا کر گندی نالی میں پھینک دوں گی۔“ راشدہ غرائی۔

”اوہو...... بڑی آئیں دوپٹہ گندی نالی میں پھینکنے والی، میں تمہارے بال قینچی سے کاٹ دوں گی۔“ سعدیہ نے جوابی دھمکی دی۔

”تمہاری یہ ہمت۔“ راشدہ نے آگے بڑھ کر سعدیہ کو بالوں سے پکڑ لیا۔

”ارے دونوں بہنوں میں پھر جھگڑا شروع ہو گیا۔“

امی بڑبڑاتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں۔ اُس وقت تک دونوں بہنوں میں مارپیٹ شروع ہو چکی تھی۔

دونوں بہنوں میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑا روز ہوتا تھا۔

---☆☆---

سعدیہ اور راشدہ کی عمروں میں مشکل سے دو سال کا فرق ہو گا۔ سعدیہ بڑی تھی، مگر بچپن میں بیمار رہنے کی وجہ سے ذرا دُبلی پتلی رہ گئی تھی، راشدہ چھوٹی تھی مگر اُس کی صحت بہتر تھی۔ یوں، دونوں بہنیں بالکل ہم عمر لگتی تھیں، لیکن ان

دونوں کی آپس میں بالکل نہیں بنتی تھی۔ دونوں ایک ہی اسکول میں اور ایک ہی کلاس میں پڑھتی تھیں لیکن کلاس روم میں دونوں بہنیں الگ الگ ڈیسک پر بیٹھتیں۔ دونوں کی سہیلیاں الگ الگ تھیں۔ دونوں کی دلچسپیاں بھی الگ تھیں۔

دونوں بچیاں اب ساتویں کلاس میں پہنچ چکی تھیں۔ راشدہ بارہویں برس میں تھی اور سعدیہ چودہ برس کے ہونے والی تھی۔ دونوں کے درمیان لڑائی اب بھی روزانہ ہوتی تھی۔ اب جھگڑا اس بات پر ہوتا تھا کہ گھر کے کام کون کرے۔

سعدیہ کا خیال تھا کہ امی اور ابو، راشدہ پر زیادہ توجہ دیتے ہیں، اُس کی تمام ضروریات کا خیال رکھتے ہیں، اُس کی ہر فرمائش پوری کرتے ہیں، وہ بیمار ہو جائے تو بے چین ہو جاتے ہیں۔ فوراً ڈاکٹر کے پاس لے جاتے ہیں، جب کہ راشدہ بھی امی اور ابو کے بارے میں کچھ اسی انداز سے سوچتی تھی۔ اُس کا بھی یہی خیال تھا کہ امی اور ابو سعدیہ کو زیادہ چاہتے ہیں۔ اُس کو گھر کے کام کرنے کے لیے بھی نہیں کہتے۔ وہ ذرا سی فرمائش کرے تو فوراً دوڑ کر پوری کرتے ہیں، یہاں تک کہ سعدیہ کی سہیلیاں ملنے آتی ہیں تو اُن کی بھی خوب خاطر تواضع کرتے ہیں۔

دونوں بہنوں کو امی اور ابو سے تقریباً ایک جیسی شکایتیں تھیں۔ اس انداز میں سوچنے کا نتیجہ یہ تھا کہ دونوں بہنوں کے دلوں میں ایک دُوسرے کے لیے نفرت روز بروز بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

اِسی نفرت کا اظہار ایک دن اس طرح ہوا کہ ایک شام امی ابو کو ایک تقریب میں جانا تھا۔ دادی اماں، پھوپھی جان کے گھر رہنے گئی ہوئی تھیں، سعدیہ اور راشدہ کے امتحان ہونے والے تھے، اس لیے امی ابو نے فیصلہ کیا کہ دونوں بہنیں گھر پر رک کر امتحان کی تیاری کریں۔ دونوں بہنوں کو آپس میں نہ لڑنے کی کئی بار نصیحت کر کے امی اور ابو تقریب میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر تک تو دونوں بہنیں بیٹھی پڑھتی رہیں، پھر راشدہ اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگی، اسی وقت سعدیہ اٹھ کر کسی کام سے اسٹور میں گئی تو راشدہ جلدی سے اٹھی اور اُس نے اسٹور کا دروازہ بند کر کے باہر سے کنڈی لگا دی۔ سعدیہ بڑی دیر تک دروازہ کھٹکھٹاتی رہی۔ راشدہ کو آوازیں دیتی رہی۔ اسٹور میں بلب تو تھا مگر اس کا سوئچ اسٹور سے باہر تھا۔ راشدہ نے دُوسرا غضب یہ کیا کہ اسٹور کے بلب کا سوئچ بند کر دیا۔ نتیجہ یہ کہ اسٹور میں گھپ اندھیرا ہو گیا۔ سعدیہ تقریباً ڈھائی گھنٹے تک اسی حالت میں اسٹور میں بیٹھی رہی۔ آخر جب امی ابو واپس آئے تو راشدہ نے اسٹور کا دروازہ کھولا۔ اندر سے سعدیہ پسینے میں شرابور باہر نکلی۔ اُس نے نکلتے ہی راشدہ کا منہ نوچ لیا، اُسے بالوں سے پکڑ کر مارنا شروع کر دیا۔ پھر اُسے دھکا دے کر روتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

امی ابو نے راشدہ کو بہت ڈانٹا، سعدیہ کو بہت سمجھایا، مگر وہ کئی گھنٹوں تک روتی رہی۔ اس واقعے کے ایک ہفتے بعد ایک دن راشدہ اپنے کمرے میں میز کرسی پر بیٹھ کر ٹیسٹ کی تیاری کر رہی تھی کہ دن بھر کی تھکاوٹ کی وجہ سے اُس کو نیند آ گئی۔ نیند میں راشدہ نے خواب میں دیکھا کہ سعدیہ بیمار پڑ گئی ہے۔ امی ابو اُسے اسپتال لے گئے۔ سعدیہ کے مختلف ٹیسٹ ہوئے اور ڈاکٹروں نے اس کی حالت کو بہت خطرناک قرار دے کر اسے اسپتال میں داخل کر لیا۔ رپورٹ کے مطابق سعدیہ کا جگر خراب ہو چکا تھا۔ وہ بچپن میں بھی کئی بار بیمار ہو چکی تھی اور درست علاج نہ ہونے کی وجہ سے جگر کی خرابی بڑھتی گئی۔ صرف دو ہفتے بعد سعدیہ کا انتقال ہو گیا۔

گھر پر اب عجیب ویرانی اور اداسی چھائی رہتی تھی۔ راشدہ، سعدیہ کی چیزیں دیکھتی تو بلک بلک کر رونے لگتی۔ وہ چپکے چپکے کہتی:

”سعدیہ میں اب تم سے کبھی نہیں لڑوں گی۔“ مگر ظاہر ہے ایسی باتوں کا اب کوئی فائدہ نہ تھا۔

ایک دن راشدہ گھر کی صفائی کر رہی تھی تو اُسے سعدیہ کی ڈائری ملی۔ اس کا دل چاہا کہ ڈائری کھول کر پڑھ لے۔ اُس نے پہلا صفحہ الٹا، لکھا تھا:

”مجھے راشدہ سے نفرت ہو گئی ہے وہ بھی تو مجھ سے نفرت کرتی ہے۔“

اس کے آگے پڑھنے کی راشدہ کے اندر ہمت نہ تھی۔

اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہونے لگی۔ وہ روتی ہوئی، دادی اماں کے پاس پہنچی اور ان کی گود میں سر رکھ کر اس طرح روئی کہ دادی کے لیے اسے چپ کرانا مشکل ہو گیا۔ بہت سمجھانے پر راشدہ نے سعدیہ کی ڈائری کے بارے میں بتایا اور یہ کہہ کر پھر رونے لگی:

"اب میں سعدیہ کو کیسے مناؤں گی۔"

دادی اماں نے کہا: "ہے بیٹی ایک طریقہ۔"

"جی؟" راشدہ نے آنسو بہاتے ہوئے دادی اماں کی طرف دیکھا۔

"کون سا طریقہ؟"

"بیٹی، تم اب ہر کام کرتے ہوئے یہ خیال رکھو کہ اس سے اللہ راضی ہوتا ہے یا ناراض، نمازیں پڑھو، قرآن مجید کو پڑھو، اس سمجھو، اس پر عمل کرو۔ خوب نیک کام کرو، ماں باپ کا کہنا مانو، اُن کی خدمت کرو، اُن کی دُعائیں لو...... اور سعدیہ کے لیے زیادہ سے زیادہ دُعائیں کرو، اس کے لیے قرآن پاک پڑھو، غریبوں کی مدد کر کے اس کا ثواب سعدیہ کو پہنچاؤ۔"

"پھر سعدیہ راضی ہو جائے گی دادی اماں؟"

"بیٹی اُمید یہی ہے۔ دیکھو جب تم اچھی بن جاؤ گی اور ہمیشہ نیک کام کرو گی، برائیوں سے بچو گی تو اللہ تعالیٰ تمہیں جنت میں داخل فرمائیں گے اور تم سعدیہ کے لیے زیادہ سے زیادہ دُعائیں کرو گی اور اس کو ثواب پہنچاؤ گی تو اللہ تعالیٰ سعدیہ کو بھی جنت عطا فرمائیں گے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن پاک میں ایک وعدہ فرمایا ہے۔"

"وہ کیا دادی اماں؟" راشدہ نے بے تابی سے پوچھا۔

"ٹھہرو میں تمہیں سناتی ہوں۔" دادی اماں نے سامنے رکھا ترجمے والا قرآن مجید کھولا اور اس کے صفحے پلٹنے کے بعد ایک جگہ رک کر پڑھنے لگیں:

"دیکھو یہ سورۃ الاعراف کی آیت تینتالیس ہے، لکھا ہے: "جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک اعمال کیے، ہم کسی پر اُس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے، وہ اہل جنت ہیں، جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اُن کے دلوں میں ایک دُوسرے کے خلاف جو کچھ کینہ، کھوٹ ہو گا، اُسے ہم نکال دیں گے۔ (الاعراف۔ ۴۳)

راشدہ جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی:

"دادی اماں، اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے، آپ نے آج مجھے کتنی کام کی بات بتائی ہے۔ میں ابھی وضو کر کے آتی ہوں، عشاء کا وقت ہو گیا ہے نا۔" اور دادی اماں کہہ رہی تھیں:

"بیٹی جب دُعا مانگو تو اپنی دادی اماں کو نہ بھولنا۔"

راشدہ نے وضو کے لیے نل کی ٹونٹی کھولی تو شاید اس ٹونٹی میں کسی خرابی کی وجہ سے پانی کے چھینٹے کسی فوارے کی طرح اچھل کر راشدہ کے منہ پر آئے۔ پانی بہت ٹھنڈا تھا۔ اس ٹھنڈک کی وجہ سے راشدہ کی آنکھ کھل گئی۔

آنکھ کھلتے ہی راشدہ کو سعدیہ کی ہنستی ہوئی صورت نظر آئی۔ سعدیہ ہاتھ میں پانی کا گلاس تھامے، کرسی پر سوئی ہوئی راشدہ کے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار رہی تھی تاکہ وہ اُٹھ کر عشاء کی نماز ادا کر لے۔ راشدہ کی سمجھ میں اب آیا کہ وہ بڑی دیر سے خواب دیکھ رہی تھی۔

وہ جلدی سے کرسی سے اٹھی، اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اُس نے سعدیہ کو گلے لگا لیا۔ وہ سعدیہ کے کان میں سرگوشی کر رہی تھی۔

"میری پیاری بہن سعدیہ، مجھے معاف کر دینا۔"

خوب صورتی

☆ اِنسان کی خوب صورتی اخلاق سے ہے۔
☆ اخلاق کی خوب صورتی الفاظ سے ہے۔
☆ الفاظ کی خوب صورتی اعمال سے ہے۔
☆ اعمال کی خوب صورتی کردار سے ہے۔
☆ کردار کی خوب صورتی درویشی سے ہے۔
☆ درویشی کی خوب صورتی عبادت سے ہے۔
☆ عبادات کی خوب صورتی ایمان سے ہے۔
☆ مسلمان کی خوب صورتی اللہ پر بھروسے سے ہے۔

(الطاف اللہ لطف، کانگڑہ)

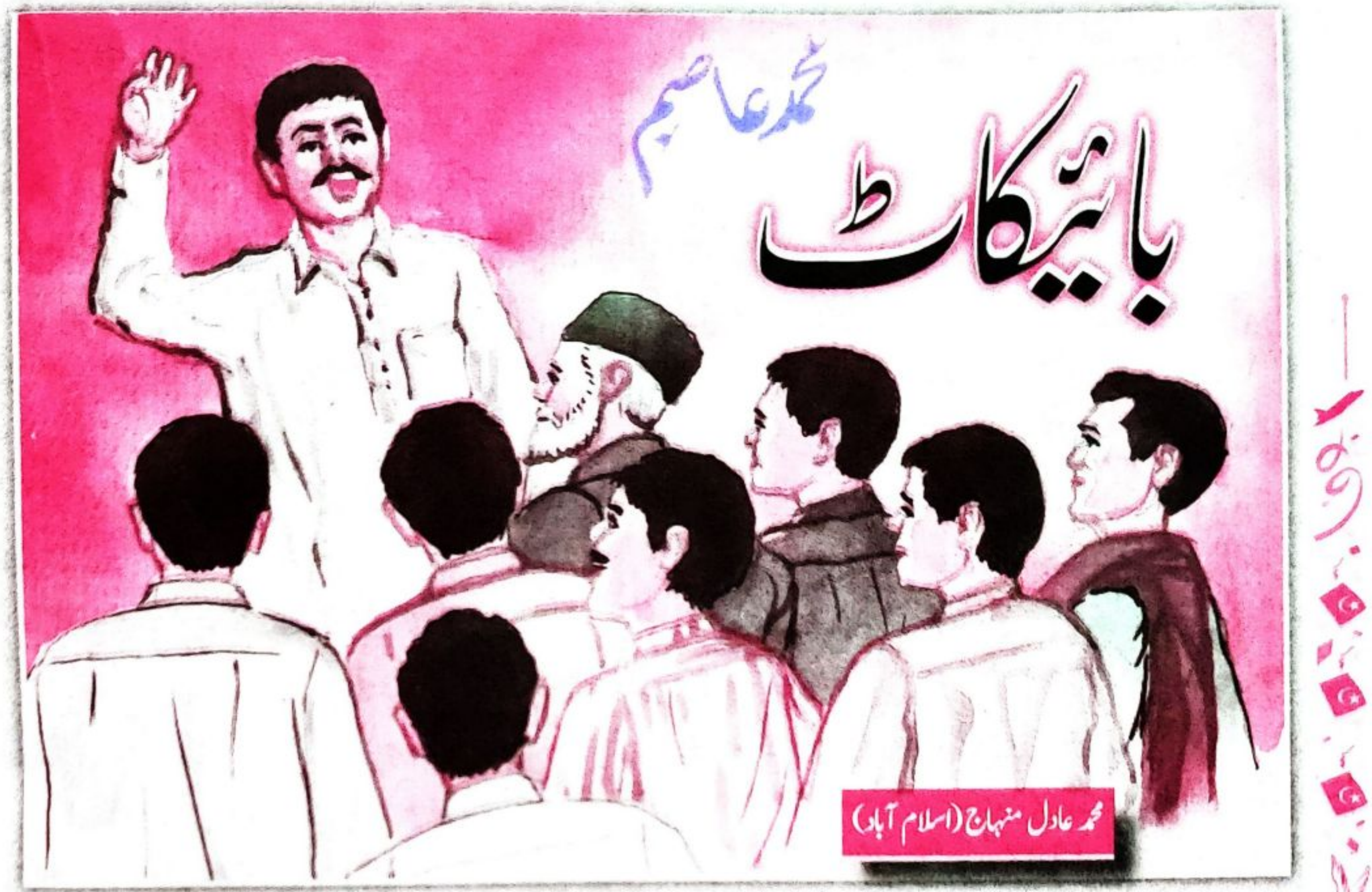

بائیکاٹ

محمد عادل منہاج (اسلام آباد)

"اللہ کا شکر ہے کہ ہماری برسوں کی آرزو پوری ہوگئی اور اپنی چھت نصیب ہوئی۔" سرفراز صاحب مطمئن لہجے میں بولے۔

"مگر یہ جگہ شہر سے دُور ہے۔ آس پاس کوئی گھر بھی بنا ہوا نہیں ہے، سنسان سی جگہ لگتی ہے۔" بیگم سرفراز کچھ پریشان تھیں۔

"ہاں ابو! یہاں سے سکول آنا جانا بھی ایک مسئلہ ہو گا۔" اُن کا بیٹا ساجد بولا۔

"بھئی خدا کا شکر کرو کہ اپنا گھر تو بن گیا نا۔ باقی مسئلے تو ہر جگہ ہوتے ہیں۔ آج یہ جگہ سنسان لگتی ہے تو کل آباد بھی ہو جائے گی۔ ساری جمع پونجی لگا کر تو بمشکل اس جگہ گھر بنا سکے ہیں ورنہ آج کل اپنا گھر بنانا کتنا مشکل ہے۔" سرفراز صاحب بولے۔

سرفراز صاحب ایک سرکاری ملازم تھے اور اُن کی ریٹائرمنٹ کا وقت قریب آتا جا رہا تھا۔ ساری عمر کرائے کے گھر میں گزری تھی۔ ایک مدت سے آرزو تھی کہ اُن کا بھی اپنا ایک گھر ہو۔ پھر کچھ عرصے پہلے انہوں نے سنا کہ شہر سے کچھ فاصلے پر ایک نئی سوسائٹی بن رہی ہے جہاں پلاٹ خاصے سستے ہیں۔ انہوں نے جگہ دیکھ کر وہاں پلاٹ لے لیا۔ پھر اپنی گریجوئٹی کی رقم نکلوا کر گھر بنوانا شروع کر دیا۔ یہاں ابھی اتنے زیادہ گھر نہیں بنے تھے۔ مشکل سے بیس پچیس گھر ہوں گے۔ جس گلی میں سرفراز صاحب کا گھر تھا۔ اس میں تو ابھی کوئی گھر ہی نہیں بنا تھا۔ مگر سرفراز اصاحب پھر بھی خوش تھے کہ اپنا گھر تو بن گیا ہے، آہستہ آہستہ یہاں بھی لوگ آباد ہو جائیں گے۔

---☆☆---

مسجد میں بس دس بارہ ہی نمازی تھے۔ اس سوسائٹی کی مسجد ابھی تعمیر ہو رہی تھی۔ فی الحال ایک کمرہ بنا کر اُس میں نماز ادا کی جا رہی تھی۔ سرفراز صاحب نماز ادا کر کے باہر نکلے تو ایک باریش بزرگ اُن کی طرف بڑھے۔

"السلام علیکم! آپ شاید نئے آئے ہیں۔" وہ بولے۔

"جی ہاں! میں کل ہی یہاں شفٹ ہوا ہوں۔ وہ اس طرف میرا گھر ہے۔" سرفراز صاحب نے اشارے سے بتایا۔

"بہت خوشی ہوئی۔ میرا نام جاوید ہے۔ میں چھ ماہ سے یہاں رہ رہا ہوں۔ آپ کبھی تشریف لائیں۔ میرا گھر گلی

نمبر 5 میں ہے۔" وہ بولے۔

"ضرور، ہمارے آس پاس تو ابھی کوئی گھر بنا ہی نہیں۔ پڑوسیوں کی کمی محسوس ہوتی ہے۔" سرفراز صاحب بولے۔

"آپ مجھے ہی اپنا پڑوسی سمجھیں۔ آئیے آپ کو اپنا گھر دکھاؤں۔" جاوید صاحب مسکرا کر بولے۔

---☆☆---

ساجد سامان کا شاپر لیے گھر میں داخل ہوا۔ "یہ لیں امی یہاں تو ہر چیز بہت مہنگی ہے۔ 10 روپے کی ڈبل روٹی پندرہ میں ملی ہے۔" وہ بولا۔

"اس طرح تو بہت مسئلہ ہو جائے گا۔ آپ ذرا دُکان دار سے بات کریں۔" بیگم سرفراز بولیں۔

اس سے کیا بات کروں بیگم۔ پوری سوسائٹی میں صرف ایک جنرل سٹور ہے۔ اُسے بھی پتہ ہے کہ سب نے سامان یہاں سے ہی لینا ہے اس لئے خوب لوٹ رہا ہوں۔ اگر دو چار دُکانیں ہوتیں تو آپس میں مقابلہ ہوتا۔" سرفراز صاحب بولے۔

"اس طرح تو تنخواہ پندرہ دنوں میں ہی ختم ہو جایا کرے گی۔" وہ پریشانی سے بولیں۔

"فکر مت کرو یہ کچھ عرصے کا مسئلہ ہے پھر یہاں اور دُکانیں بھی کھل جائیں گی۔ فی الحال میں یہ کیا کروں گا کہ دفتر سے واپسی پر کچھ سودا شہر سے لیتا آیا کروں گا۔" انہوں نے دلاسا دیا۔

---☆☆---

"خیر تو ہے سرفراز صاحب! موڈ کچھ خراب لگتا ہے۔" جاوید صاحب بولے جو سڑک پر دُوسری طرف سے آرہے تھے تو اُن کی نظر سرفراز صاحب پر پڑی تھی جو ہاتھ میں شاپر اٹھائے آرہے تھے۔

"کیا بتاؤں جاوید صاحب! اس جنرل سٹور والے کا دماغ تو بالکل ہی خراب ہو گیا ہے۔" سرفراز صاحب کا موڈ خراب تھا۔

"کیوں کیا ہوا؟" جاوید صاحب چونکے۔

"چیزیں تو یہ مہنگی دیتا ہے ہے مگر اب تو حد کر دی ہے پہلے دو چار روپے کا فرق ہوتا تھا اب ہر چیز کی قیمت ڈبل کر دی ہے۔"

"ہاں! اس بات سے تو سب لوگ پریشان ہیں۔ کچھ کا جھگڑا بھی ہوا ہے۔ مگر کیا کریں کہ یہاں واحد دُکان اسی کی ہے اور ہم شہر سے اتنی دُور بیٹھے ہیں۔" جاوید صاحب نے آہ بھری۔

"میں تو کافی سامان دفتر سے واپسی پر شہر سے لے آتا ہوں مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ ضرورت پڑ ہی جاتی ہے۔"

"بس صبر کریں اور ہم کر بھی کیا کر سکتے ہیں۔" وہ بولے۔

"ہو تو بہت کچھ سکتا ہے اگر ہم لوگ چاہیں۔"

"کیا مطلب؟" جاوید صاحب چونکے۔ "دیکھیں! یہاں پچیس تیس کے قریب گھر ہیں۔ ان کی وجہ سے ہی اس کی دُکان چل رہی ہے۔ اگر ہم سب مل کر ایک ہفتہ بھی اس کی دُکان سے خریداری نہ کریں تو اس کا دماغ درست ہو جائے گا۔"

"مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہاں سے سامان نہ لیں تو پھر کہاں سے لیں؟"

"دیکھیں ہر کام کے لیے قربانی دینا پڑتی ہے۔ ہمیں آپس میں مل کر ایک لائحہ عمل بنانا چاہیے کہ ایک ہفتہ کسی نہ کسی طرح گزارا کر لیں گے۔ شہر سے جا کر اکٹھا سامان لے آئیں۔ جن کے پاس گاڑیاں ہیں وہ دُوسروں کی مدد کریں۔ یہ صرف ایک ہفتہ بھی خالی ہاتھ بیٹھا رہا تو اسے سمجھ آجائے گی۔" سرفراز صاحب نے کہا۔

"کہتے تو آپ ٹھیک ہیں مگر لوگ ساتھ نہیں دیتے۔"

"ہاں! یہی تو ہماری قومی کمزوری ہے کہ ہم ہر بات چپ چاپ برداشت کرتے ہیں۔ پھر بھی ہمیں سب سے بات تو کر کے دیکھنی چاہیے۔ سب نہ سہی آدھے لوگ بھی اگر ہمارا ساتھ دیں تو ہم اپنا مقصد حاصل کر سکتے ہیں۔" وہ بولے۔

"ٹھیک ہے سرفراز صاحب، پھر آج شام مسجد میں سب سے بات کر کے دیکھتے ہیں۔"

"اکبر جنرل سٹور" اس سوسائٹی کا واحد سٹور تھا جہاں

پرچون کی ساری چیزوں کے علاوہ پھل اور سبزیاں بھی ملتی تھیں۔ چونکہ دُور دُور تک اور کوئی دُکان نہیں تھی اس لیے ہر شخص یہیں سے خریداری کرتا، اس بات نے اس کا دماغ خراب کر دیا اور وہ منہ مانگی۔ قیمتیں طلب کرنے لگا۔ لوگ بھی تھوڑی بہت بحث کر کے چپ ہو جاتے۔ مگر اب دو دن سے ایک عجیب سلسلہ ہوا کہ ایک آدھ شخص کے سوا کوئی اس کی دُکان میں داخل ہی نہیں ہوا۔ چونکہ پھل سبزیاں وہ روزانہ منڈی سے لاتا تھا اس لئے وہ پڑی پڑی خراب ہو گئیں۔ پھر جاوید صاحب اُسے سمجھا کر گئے کہ اُس کی مہنگی چیزیں فروخت کرنے کی وجہ سے سب لوگوں نے اُس کا بائیکاٹ کر دیا ہے۔ وہ یہ سن کر مسکرا دیا تھا اور بڑی لاپرواہی سے کہا کہ لوگ بائیکاٹ کرتے ہیں تو کرتے رہیں۔

مگر اب وہ حقیقتاً پریشان تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ بس چند لوگ ہی ایسا کریں گے ورنہ کون شہر سے جا کر خریداری کرے گا۔ مگر لگتا تھا کہ لوگ اس سے کچھ زیادہ ہی تنگ آ چکے تھے۔ اس لئے سب سرفراز صاحب کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئے۔

چھٹے دن اکبر سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اب کیا کرے۔ دو دن سے وہ منڈی بھی نہیں گیا تھا کہ پھل سبزیاں اسے پھینکنی پڑی رہی تھیں۔ دودھ دہی کے ڈبوں کی آخری تاریخ بھی گزرنے والی تھی پھر وہ بھی ضائع کرنے پڑتے۔ اب اس کے پاس دو ہی راستے تھے یا تو سوسائٹی والوں کا جائز مطالبہ مان لیتا اور ناجائز منافع خوری چھوڑ دیتا یا پھر اپنی دُکان بند کر دیتا۔ مگر جما جمایا کاروبار چھوڑ کر وہ کہاں جاتا؟ اُس نے بھی بڑی مشکل سے یہاں گھر بنایا تھا اور یہ دُکان کھولی تھی۔ شہر میں دُکان حاصل کرنا کتنا مشکل ہے یہ اُسے بھی پتہ تھا۔

---☆☆---

''مبارک ہو سرفراز صاحب۔ اکبر کا دماغ درست ہو گیا ہے۔'' جاوید صاحب خوشی سے بولے۔ ''وہ کیسے؟'' سرفراز صاحب نے چونک کر پوچھا۔

''ابھی اکبر میرے پاس آیا تھا۔ وہ اپنی غلطی پر نادم تھا اور کہہ رہا تھا کہ وہ واقعی لالچ میں آ گیا تھا۔ اب وہ مہنگی چیزیں فروخت نہیں کرے گا۔ درخواست کر رہا تھا کہ سب لوگ خریداری وہیں سے کیا کریں۔'' انہوں نے بتایا۔

''واہ...... بہت خوب۔ یہ ہوتی ہے اتحاد کی برکت۔ اگر ہم سب مل کر یہ قدم نہ اٹھاتے تو یہ ساری عمر سیدھا نہ ہوتا۔'' سرفراز صاحب خوشی سے بولے۔

''واقعی، چند دن تکلیف تو اٹھانا پڑی مگر اب ہمیشہ کا سکون ہو گیا ہے۔ آپ کی بات واقعی درست تھی۔'' جاوید صاحب بولے۔ اس واقعے کے بعد سوسائٹی کے لوگ واقعی بہت خوش تھے اور سرفراز صاحب سے متاثر بھی تھے۔ جنہوں نے خود شہر کے کئی کئی چکر لگا کر لوگوں کو سامان لا کر دیا تھا تاکہ وہ دُکان کا مکمل بائیکاٹ کر سکیں۔ سب نے متفقہ طور پر سرفراز صاحب کو اپنا لیڈر مان لیا تھا۔

---☆☆---

''آج آپ کو بہت دیر ہو گئی۔'' بیگم سرفراز بولیں۔ سرفراز صاحب آج خاصی رات کو گھر پہنچے تھے جب کہ روز وہ شام تک گھر آ جاتے تھے۔

''ہاں بھئی شہر میں ہنگامہ تھا۔ لوگ احتجاج کر رہے تھے اسی لئے ٹریفک بلاک تھی۔'' وہ تھکے تھکے لہجے میں بولے۔

''احتجاج...... کس بات پر؟'' ساجد نے چونک کر پوچھا۔ اُس کا سکول آج کل بند تھا۔

''چند غیر ملکی اخبارات نے ہمارے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنے کی جرات کی ہے اور آپ کے کارٹون چھاپے ہیں۔ اس پر پورے ملک میں احتجاج ہو رہا ہے۔ دُکانیں بند ہیں، سڑکوں پر احتجاج کی وجہ سے ٹریفک کے بھی مسائل ہیں۔'' انہوں نے بتایا۔

''اوہ...... یہ تو بہت بُری بات ہے۔ مگر اس طرح دُکانیں بند کرنے اور ٹریفک بلاک کرنے سے ان ممالک کا کیا بگڑے گا؟'' ساجد بولا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو۔ ان کا تو کوئی نقصان نہیں۔ ہم کاروبار بند کر کے اور اپنے ہی شہریوں کو تکلیف دے کر اپنے ملک کا ہی نقصان کر رہے ہیں۔'' سرفراز صاحب بولے۔

"مگر ہمیں کچھ نہ کچھ تو کرنا چاہیے۔ آخر یہ ہمارے دین کا معاملہ ہے۔" بیگم سرفراز بولیں۔

"ہاں! یقیناً کرنا چاہیے۔ ان کافروں کو بتانا چاہیے کہ ہمارے ضمیر ابھی اتنے مردہ نہیں کہ ہم اپنے پیارے نبیؐ کی توہین برداشت کر سکیں۔ مگر اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہم ان ممالک کا معاشی بائیکاٹ کریں۔ ان کی کمپنیوں کی بنی ہوئی چیزیں خریدنا چھوڑ دیں۔" سرفراز صاحب بولے۔

"اس سے کچھ نہیں ہو گا ابو! بھلا ہم چند لوگوں کے بائیکاٹ سے کیا ہوگا۔" ساجد بولا۔

"ہاں! مگر یاد رکھو کہ ان کے سب سے بڑے خریدار مسلمان ہی ہیں جو دُنیا میں دو ارب کے قریب ہیں۔ تمہیں یاد ہو گا کہ جب ہم اس سوسائٹی میں نئے نئے آئے تھے تو اکبر جنرل سٹور والا مہنگی چیزیں دیتا تھا۔ ہم نے صرف چند دن اس کا بائیکاٹ کیا تھا تو اُس کے ہوش ٹھکانے آگئے تھے۔ اگر سارے مسلمان ان کمپنیوں کی چیزیں لینا بند کر دیں تو ان کا دیوالیہ نکل جائے گا۔" وہ بولے۔

"مگر اب سب لوگ ایسا کب کریں گے۔ مارکیٹ میں ہر چیز ان کمپنیوں کی ہے، کھانے پینے کی ہر چیز پر ان کی اجارہ داری ہے۔ آپ دیکھیں کہ صرف ایک کمپنی اے بی سی کے دودھ، دہی، شربت، چائے، کریم، کسٹرڈ، جیم اور اچار کے مقابلے پر کوئی دُوسری کمپنی نہیں۔ اب لوگ کیا کریں۔"

"بیٹے! ہر بڑے مقصد کو پانے کے لیے قربانی دینا پڑتی ہے۔ اگر ہم کچھ عرصہ یہ چیزیں استعمال نہ کریں تو کیا مر جائیں۔ کیا کھانے پینے کی یہ چیزیں ہمارے نبیؐ کی محبت سے بڑھ کر ہیں۔ تم نے وہ حدیث نہیں سنی کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ مجھ سے اپنے والدین اور تمام لوگوں سے زیادہ سے محبت نہ کرے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں ابو!" چلیں پھر کم از کم ہم تو اب ان کمپنیوں کی کوئی چیز نہیں خریدیں گے باقی لوگ جو بھی کریں۔" ساجد نے کہا۔

"صرف ہم نہیں...... ہم باقی لوگوں کو بھی سمجھائیں گے۔ اب اس سوسائٹی میں تین جنرل سٹور ہیں۔ ہم مل کر اُن سے کہیں گے کہ آئندہ ان کمپنیوں کی کوئی چیز سٹور میں نہ رکھیں۔ بے شک کسی ملکی کمپنی کی چیزیں رکھ دیں جس کا معیار کم ہی کیوں نہ ہو۔ مجھے یقین ہے کہ سوسائٹی کے لوگ میرا ساتھ دیں گے۔ ہم ایک مثال بنیں گے۔ یہ سوسائٹی ایک مثال بنے گی پورے شہر کے لیے پورے ملک کے لیے۔ اب تو انفارمیشن کا دور ہے۔ ہم سب مل کر ای میل کے ذریعے، ایس ایم ایس کے ذریعے لوگوں کو بتائیں گے کہ ہم نے ان کمپنیوں کا بائیکاٹ کر دیا ہے۔ سب مل کر ہمارا ساتھ دیں تو چند دن میں ہی ان کمپنیوں کا اچھا خاصا نقصان ہو گا کہ ان کے ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔ یاد رکھو آج کے دور میں معیشت ہی سب کچھ ہے۔ زبانی کلامی باتوں اور احتجاج سے کچھ نہیں ہو گا۔" سرفراز صاحب کہتے چلے گئے۔

---☆☆---

پھر واقعی سوسائٹی والوں نے کمال کر دکھایا۔ انہوں نے سرفراز صاحب کو لیڈر مانا ہوا تھا۔ سب نے اُن کی آواز پر لبیک کہا اور تینوں جنرل سٹور والوں سے بات کی کہ آئندہ ان چند کمپنیوں کی چیزیں دُکان میں نہ رکھیں۔ رکھیں گے بھی تو کوئی خریدے گا نہیں۔ انہوں نے معلومات حاصل کیں کہ ان کے متبادل چیزیں کیا کیا ہو سکتی ہیں۔

جن کے گھر انٹرنیٹ تھا انہوں نے ای میل اور بلاگ وغیرہ پر لوگوں کو بتانا شروع کیا کہ یہ ملک کی واحد سوسائٹی ہے جس نے نبیؐ کی محبت کا عملی ثبوت دیا ہے۔

بائیکاٹ کا دائرہ بڑھنے لگا۔ اے بی سی کی گاڑی جہاں جاتی۔ دُکان دار معذرت کر لیتے۔ کمپنی کا مقامی سربراہ پریشان تھا اور کمپنی کی انتظامیہ کو خط لکھنے میں مصروف تھا۔

معاشی بائیکاٹ خود کش دھماکوں سے بڑا ہتھیار ہے جس سے اپنے ہی مسلمان بھائی نہیں مرتے بلکہ دشمن اپنی موت آپ مر جاتا ہے۔

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے

ق	گ	ف	ٹ	ب	ا	ل	ح	ب	ڈ
ک	و	ظ	ل	ٹ	ب	ی	ب	گ	ر
ب	ل	ر	ب	ی	ڈ	م	ن	ٹ	ن
ڈ	ف	آ	ہ	م	ش	ی	ک	ا	ہ
ی	چ	ت	گ	ٹ	ب	م	ظ	ع	و
و	ش	خ	د	ک	س	ٹ	ر	خ	پ
گ	ن	ش	ن	ر	غ	ٹ	ی	ن	س
م	ڑ	ک	ق	ک	ر	ض	ا	ٹ	ل
ش	ط	ر	ن	ج	ے	ن	ص	ی	ا
خ	ز	ف	آ	ء	س	ہ	ا	ک	ی

آپ نے حروف ملا کر دس کھیلوں کے نام تلاش کرنے ہیں۔ آپ ان کھیلوں کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، اُوپر سے نیچے اور نیچے سے اُوپر تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن کھیلوں کو آپ نے تلاش کرنا ہے وہ درج ذیل ہیں۔

کرکٹ۔ فٹ بال۔ بیڈ منٹن۔ شطرنج۔ کبڈی۔ گولف۔ رگبی۔ ہاکی۔ ٹینس۔ آئس ہاکی

آزادی کی خاطر

(محمد عثمان قاسمی، جھنگ صدر)

قیامِ پاکستان کے وقت میرے دادا جان کی عمر تقریباً 13 سال تھی۔ جب وہ ہندوستان سے ہجرت کر کے آئے تو اس دوران ان کے ساتھ پیش آنے والے دردناک واقعات رونگٹے کھڑے کر دینے کے لیے کافی ہیں۔ آیئے وہ واقعات اُن کی زبانی ملاحظہ کیجیے۔

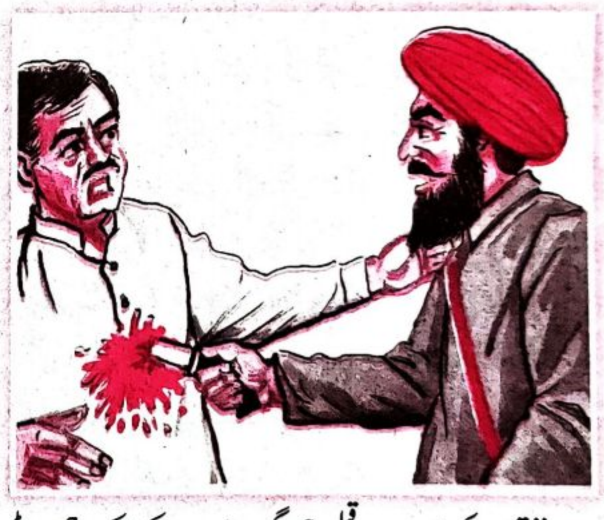

"قیامِ پاکستان سے قبل ہم گورداسپور کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتے تھے۔ ہمارا گھرانہ ماں باپ، ایک بہن اور تین بھائیوں پر مشتمل تھا۔

14 اگست کا دن تھا۔ سورج بڑی آب وتاب سے چمک رہا تھا۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ ہمارے گاؤں میں سے کافی لوگ جا چکے تھے۔ ہم سب گھر والے پاکستان جانے کے لیے تیار تھے سوائے ابا جان کے...... ابا جان ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر پائے تھے۔ شاید وہ اس علاقے کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے کیونکہ یہاں ہماری بہت سی جائیداد اور جانور وغیرہ تھے۔ ہمارے بزرگوں کی قبریں بھی یہیں تھیں۔ اسی کشمکش میں دن کا پہلا پہر گزر گیا۔

"ابا...... اتنی دیر ہو گئی ہے آپ چلتے کیوں نہیں؟ آخر آپ اتنی دیر کیوں کر رہے ہیں......؟ دیکھیں ابا...... اگر اب ہم نے مزید دیر کی تو ہمارا بھی وہی حشر ہو گا جو......" ابھی میری بات مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ ابا جان نے مجھے چپ کرا دیا۔

"ہاں بیٹا! ابھی چلتے ہیں۔ پھر ہم نے کچھ سامان اپنے ساتھ لے جانے کے لیے تیار کیا...... اس کے علاوہ کچھ چاندی کے سکے بھی اس سامان میں چھپا دیئے اور رات کا انتظار کرنے لگے۔ جب گہرا اندھیرا چھا گیا تو ہم اللہ کا نام لے کر چل پڑے۔ خوف ہمارے ذہنوں پر سوار تھا۔ لیکن اس خوف کے ساتھ ایک اُمید بھی تھی۔ اور وہ اُمید تھی پاکستان پہنچنے کی۔

ہم اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھے۔ راستے میں پڑی معصوم بچوں اور بے گناہ لوگوں کی کٹی پھٹی لاشیں ظالم اور سفاک لوگوں کی جارحیت کا ثبوت پیش کر رہی تھیں۔ چلتے چلتے ہم اپنے گاؤں سے بہت دُور نکل گئے تھے۔ اچانک ایک گھڑ سوار سکھ ہمارے سامنے آگیا۔ ہمارے چلتے قدم وہیں ساکت ہو گئے۔ گھڑ سوار کے ہاتھ میں چمکتا ہوا تیز دھار خنجر دیکھ کر ہماری آنکھوں میں خوف پھیل گیا۔ گھڑ سوار نے آگے بڑھ کر ابا جان سے میرا سب سے چھوٹا بھائی (خورشید) چھین لیا۔

"مت مار میرے بیٹے کو...... ظالم...... رحم کر......رحم......" یہ کہتے ہوئے میرے اباجان نے گھڑ سوار سے خنجر چھیننے کی کوشش کی تو اُس نے میرے بھائی کو چھوڑ دیا اور ابا جان کو بالوں سے پکڑ کر ایک جھٹکا دیا اور پھر نیچے گرا کر خنجر اُن کے سینے میں گھونپ دیا۔ اس کے بعد اُس نے دوبارہ میرے بھائی کو پکڑا اور فضا میں اچھال کر خنجر کی تیز نوک میں پرو دیا۔ معصوم خورشید بلکتا، سسکتا اور تڑپتا ہوا ٹھنڈا ہو گیا۔ یہ منظر دیکھ کر میرا وجود کانپ اٹھا...... خوف میری ایک ایک رگ میں سرایت کر گیا...... ذہن مفلوج ہو کر رہ گیا...... ظالم رنجیت سنگھ کا رخ اب میرے دُوسرے بھائی کی طرف تھا...... اسی لمحے میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اور پھر میرے ہاتھ بے اختیار زمین کی طرف بڑھ گئے...... کانپتے

ہوئے ہاتھوں سے مٹھی بھر مٹی اٹھائی اور پھرتی کے ساتھ ظالم گھڑ سوار کی آنکھوں پر جھونک دی...... اُسے سب کچھ بھول کر اپنی آنکھوں کی پڑ گئی۔ اور پھر میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اُس کے ہاتھ سے خنجر چھین لیا۔ اِس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا...... میں نے خنجر اُس کے سینے میں گھونپ دیا۔ یوں وہ ظالم اپنے انجام تک پہنچا۔

رات کا آخری پہر تھا۔ میں اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا کہ پیچھے سے ایک قافلہ آتا دکھائی دیا۔ پہلے تو میں اُسے سکھوں کا جتھہ سمجھ کر قریبی فصل میں چھپ گیا۔ لیکن جب قافلہ کچھ قریب پہنچا تو تب پتہ چلا کہ یہ سکھوں کا جتھہ نہیں بلکہ پاکستان جانے والا مسلمانوں کا قافلہ تھا۔ چنانچہ میں بھی اُن کے ساتھ ہو لیا۔

چلتے چلتے میں ایک ریلوے اسٹیشن پر جا پہنچا۔ وہاں ایک ٹرین لاہور جانے کے لیے کھڑی تھی۔ ٹرین مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ میں بھی ٹرین میں سوار ہو گیا۔ عصر تک ٹرین اسٹیشن پر ہی کھڑی رہی۔ خدا خدا کر کے ٹرین اسٹیشن سے نکلی اور پھر اپنی منزل کی طرف بھاگنے لگی۔ کبھی کبھی سڑے ہوئے انسانی گوشت کی بدبو ڈبے میں پھیل جاتی تھی۔ باہر جھانکنے پر جگہ جگہ لاشیں دُور تک بکھری پڑی نظر آتی تھیں...... کئی مقام تو ایسے بھی تھے جہاں بہت سی لاشیں ایک دُوسرے کے اُوپر پڑی ہوئی تھیں۔ ٹرین کچھ دُور جانے کے بعد ایک جنگل میں رک گئی۔ ڈرائیور سے ٹرین روکنے کی وجہ پوچھی تو اُس نے انجن میں خرابی کا بہانہ کیا۔ ابھی تھوڑی دیر ہی گزری ہو گی کہ سکھوں اور ہندوؤں کا ایک جتھہ وہاں آ پہنچا...... تمام مسافروں کے چہروں پر خوف چھا گیا...... اور گاڑی میں ہلچل مچ گئی...... آناً فاناً سکھوں اور ہندوؤں کا جنونی گروہ بے بس و مجبور اور نہتے مسافروں پر ٹوٹ پڑا۔ ظالم لوگ بے بس اور نہتے مسافروں پر مسلسل وار کر رہے تھے۔ میں ایک سیٹ کے نیچے چھپ کر اللہ تعالیٰ سے اپنی سلامتی کی دُعا کر رہا تھا...... جس سیٹ کے نیچے میں چھپا ہوا تھا اس کے سامنے والی سیٹ پر ایک عورت بیٹھی تھی...... عورت کی گود میں ایک بچہ بھی تھا...... بچہ اپنی ماں سے پانی مانگ رہا تھا کہ ایک ظالم نے اُس کی آواز سن لی۔

"ارے مہتاب سنگھ......! اس کو بڑی پیاس لگی ہے...... اور میری تلوار کو بھی بڑی پیاس لگی ہے...... کیا کرنا چاہیے...... ان دونوں کے ساتھ......؟" کنور سنگھ نے مہتاب سنگھ سے پوچھا۔

"ارے دیکھتے کیا ہو......؟ ختم کر دو اس کو اور پیاس بجھاؤ اپنی تلوار کی......؟" پھر کنور سنگھ نے آگے بڑھ کر عورت سے اُس کا بچہ چھین لیا۔

"مت مارو...... میرے بچے کو...... مت مارو...... ظالمو......! رحم کرو...... رحم......" عورت نے فریاد کی...... لیکن ظالم کسی فریاد پر کان نہیں دھر رہے تھے چنانچہ اُنہوں نے بے دردی کے ساتھ بچے کو مار دیا...... اور پھر ایک سکھ عورت کی طرف بڑھا:

"اچھا تو تجھے بھی پیاس لگی ہے......؟ کنور سنگھ نے تلوار لہراتے ہوئے کہا۔

"نن...... نہیں...... مجھے نہیں لگی...... پیاس......!"

عورت نے خوف سے کانپتے ہوئے کہا۔

"تو پھر میری تلوار کو تو بڑی پیاس لگی ہے......!"

یہ کہہ کر کنور سنگھ نے اس بے بس عورت کو تلوار کا وار کر کے ہلاک کر دیا۔

کچھ ہی دیر بعد بوگی قصاب کی دُکان کا منظر پیش کر رہی تھی...... ظالم...... وہاں سے جا چکے تھے...... اور پھر چند لمحوں کے بعد ٹرین بھی چل پڑی...... بوگی میں پڑی لاشیں دیکھ کر مجھے وحشت ہونے لگی تھی...... خوف کی وجہ سے میں سیٹ کے نیچے ہی دبکا پڑا رہا...... آخر کار ٹرین آہستہ آہستہ چلتی ہوئی لاہور اسٹیشن پر جا پہنچی...... جیسے ہی گاڑی رُکی...... میں سیٹ کے نیچے سے نکلا اور گاڑی سے اترتے ہی پاکستان کی مقدس زمین پر سجدہ ریز ہو گیا۔"

(پہلا انعام: 200روپے کی کتب)

پرچم

(روشان ارشد، رحیم یار خان)

جشنِ آزادی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ سب لوگ پیارے وطن پاکستان کی محبت میں نعرے لگا رہے تھے۔

"پاکستان زندہ باد   پاکستان پائندہ باد"

نظام کالونی کے بچوں میں خوب جوش نظر آ رہا تھا۔ بچے

گلی میں پاکستانی پرچم لگانے میں مصروف تھے کہ چچا ارشد آ گئے۔ اُن کو دیکھ کر سارے بچے فوراً اُن کے گرد جمع ہو گئے اور سب نے انہیں سلام کیا۔ چچا ارشد نے بھی سلام کا جواب دے کر

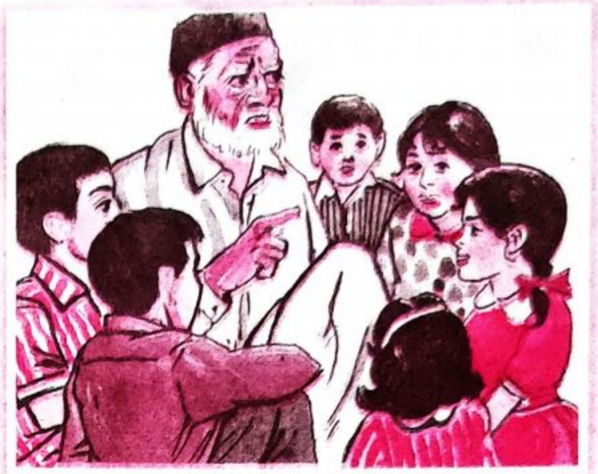

انہیں باری باری پیار کیا۔ چچا ارشد پراپرٹی ڈیلر تھے اور بہت مصروف رہتے تھے، مگر اس کے باوجود وہ شام کو گلی میں کھیلتے بچوں کے ساتھ کچھ وقت ضرور گزارا کرتے تھے۔ ان کی باتیں بچے بہت غور سے سنتے تھے۔ اُس دن بھی انہوں نے سب بچوں کو بیٹھنے کے لیے کہا اور پھر وہ کہنے لگے:

"بچو! میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں، میں نے آج صبح سڑک سے گزرتے ہوئے ایک کاغذی جھنڈا سڑک پر گرا ہوا دیکھا۔ سب لوگ وہاں سے گزر رہے تھے مگر کسی نے بھی اس طرف دھیان نہ دیا۔ میرا دِل تڑپ اٹھا۔ میں نے فوراً وہ جھنڈا اٹھایا اور اپنے سینے سے لگا لیا۔"

اتنا کہہ کر چچا ارشد کی آواز بھرا گئی۔ وہ چند لمحوں کے کے بعد دوبارہ بولے:

"مجھے یقین ہے کہ آپ لوگ میری بات سمجھ چکے ہوں گے، میں آپ سے صرف پیارے وطن کے پیارے پرچم کی حفاظت کی اپیل کرتا ہوں۔ ابھی آپ لوگ یہ نغمہ سب سے اُونچا یہ جھنڈا ہمارا رہے گا رہے تھے تو خدارا! اس جھنڈے کو اونچا ہی رکھیے، نیچا مت کیجئے۔" یہ کہہ کر چچا ارشد رومال نکال کر اپنے آنسو پونچھنے لگے۔

بچے چچا ارشد کی باتیں سن کر کچھ دیر تو خاموش رہے۔ پھر دانیال نے کہا:

"چچا! ہم اپنے پیارے پرچم کی حفاظت کریں گے، اس کو زمین پر گرنے نہیں دیں گے۔"

"اگر کوئی پرچم زمین پر گرا تو ہم اُسے فوراً اٹھا لیں گے۔" بلال بولا۔

"شاباش بچو! شاباش یہی تو میں چاہتا ہوں کہ یومِ آزادی کے موقع پر پیارے وطن کا جھنڈا زمین پر گرا ہوا دکھائی نہ دے۔"

"چچا! ایسا ہی ہو گا۔" تمام بچے یک زبان ہو کر بولے۔

(دُوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

صلہ

(انعم سلیم، لاہور)

بلال کو نوکری کی تلاش میں نکلے آج تیسرا دن تھا۔ گھر سے دیر ہونے کی وجہ سے وہ ناشتہ کیے بغیر ہی نکلا تھا۔ اب اُسے بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ایک دُکان پر رکا اور کولڈ ڈرنک اور چپس کا پیکٹ لیا اور ایک گاڑی کے ساتھ ٹیک لگا کر کھانے لگا۔ ایک فائل میں اُس کی اسناد تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ وہاں سے چلا کر تھوڑی دُور ہی گیا تھا کہ اُسے احساس ہوا کہ اُس کی فائل اُس کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ وہ واپس آیا تو گاڑی وہاں نہیں تھی۔ وہ گھر پہنچا تو اُس کا سر چکرا رہا تھا۔ وہ خاموش سا اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔ فائل میں اُس کی قیمتی اسناد تھیں۔ اُس کی امی اندر آئیں

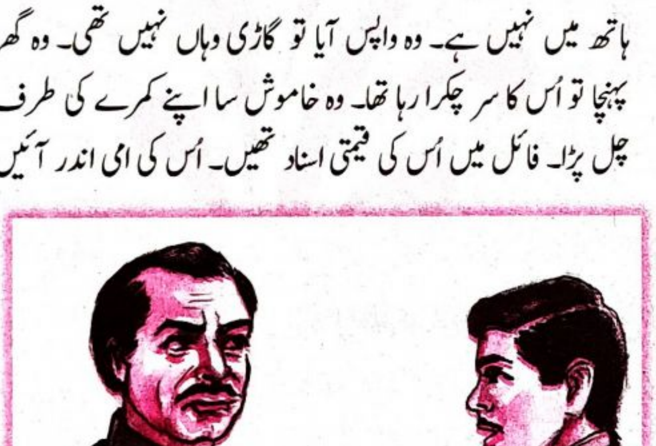

اور بولیں:

"بیٹا کیا بات ہے۔ آج جلدی آ گئے ہو؟" اُس نے امی کو ساری بات بتائی تو امی نے اُسے تسلی دی اور کہا:

"بیٹا! میرا دل کہتا ہے تمہاری فائل ضرور ملے گی۔"

شام کے وقت سب گھر والے چائے پی رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ بلال نے ریسور اٹھا تو ایک آدمی نے کہا:

"السلام علیکم! کیا آپ بلال صاحب بول رہے ہیں؟"

بلال بولا: "جی ہاں۔" دُوسری طرف سے جواب آیا:

"میں سیٹھ کرامت بول رہا ہوں۔ آپ کی فائل میں اپنے ملازم کے ہاتھ بھیج رہا ہوں۔"

اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی۔ بلال دروازے کی طرف بھاگا اور دروازہ کھولا تو باہر سفید وردی میں ملبوس ایک شخص کھڑا تھا۔

"کیا آپ بلال صاحب ہیں؟"

بلال بولا: "جی! میں بلال ہوں۔"

"جی یہ فائل سیٹھ کرامت نے بھیجی ہے۔ بلال نے خوشی سے فائل اُس سے لے لی اور اس کا شکریہ ادا کر کے اندر آگیا۔ بلال نے فائل کھول کر دیکھی تو اُس میں سونے کا ایک لاکٹ تھا۔ وہ حیران ہوا کیونکہ یہ لاکٹ اُس کا نہ تھا۔ اس نے موبائل فون سے سیٹھ کرامت کا نمبر ڈائل کیا اور کہا:

"جی مجھے آپ سے ملنا ہے آپ مجھے ایڈریس بتا دیجئے۔"

سیٹھ صاحب نے اس کو اپنا ایڈریس بتایا تو وہ تیار ہو کر گھر سے نکلا اور مطلوبہ پتے پر جا پہنچا۔

وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا کہ کچھ دیر بعد سیٹھ کرامت اندر آئے۔ بلال نے اپنا تعارف کروایا۔ سیٹھ نے کہا:

"ہاں تو بلال صاحب کیسے آنا ہوا؟"

"بلال نے جیب سے لاکٹ نکالا اور بولا: "میری فائل میں آپ کا یہ لاکٹ رہ گیا تھا۔"

سیٹھ صاحب نے جب بلال کے ہاتھ میں لاکٹ دیکھا تو ان کے چہرے پرمسکراہٹ آگئی۔ لاکٹ دیکھ کر سیٹھ صاحب بولے: "بلال بیٹا! میں نے آپ کی فائل پڑھی، یہ ایک اخلاقی جرم ہے مگر مجھے تمہارا پتہ چاہیے تھا۔ اس لیے میں نے آپ کی فائل دیکھی۔ آپ کی اسناد دیکھ کر میں بہت حیران ہوا۔ آپ کی قابلیت دیکھ کر میں نے آپ کا امتحان لینے کے لیے فائل میں لاکٹ رکھ کر آپ کی ایمان داری کا امتحان لیا۔ کیوں کہ میرے آفس میں مینجر کی اسامی خالی ہے، مجھے کسی ایمان دار اور قابل شخص کی ضرورت ہے۔ اس جاب کے لئے میں نے آپ کا انتخاب کیا ہے۔ آپ کو تنخواہ چالیس ہزار اور دیگر مراعات بھی دی جائیں گی۔" سیٹھ کرامت کی باتیں سن کر بلال خوش ہو گیا تھا۔ اُسے اُس کی ایمان داری کا صلہ جو مل گیا تھا۔ (تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

شاگرد

(ارسہ شاہد، لاہور)

حضرت جنید بغدادیؒ کے بہت سے شاگرد تھے۔ اُن میں ایک شاگرد ایسا تھا جس کے ساتھ وہ بہت مہربانی سے پیش آتے تھے۔ حضرت جنیدؒ کے دُوسرے شاگردوں کو یہ بات اچھی نہیں لگتی تھی۔ انہوں نے ایک روز اُن سے شکایت کرتے ہوئے کہا: "آخر وہ بھی ہماری طرح آپ کا شاگرد ہے۔ پھر آپ اس کے ساتھ ہم سے زیادہ اچھا سلوک کیوں کرتے ہیں؟"

حضرت جنید بغدادیؒ نے جواب دیا: "میرا یہ شاگرد ادب اور عقل میں تم سے بہت بڑھا ہوا ہے۔ اسی وجہ سے میں اسے زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔ تمہاری تسلی کے لیے ایک روز اُس کا امتحان بھی ہو جائے گا۔"

چند روز بعد حضرت جنیدؒ نے اپنے تمام شاگردوں کو جمع کر کے انہیں ایک ایک مرغی اور ایک ایک چھری دی اور کہنے لگے:

"جاؤ، ان مرغیوں کو ایسی جگہ ذبح کرو جہاں کوئی دیکھنے والا نہ ہو۔"

سب شاگرد گئے اور اپنی اپنی مرغی کو ایسی جگہ پر ذبح کر کے لے آئے جہاں کوئی آدمی نہ تھا۔ مگر وہ شاگرد اُسی طرح زندہ مرغی واپس لے آیا۔

حضرت جنید بغدادیؒ نے اُس سے پوچھا:

"کیوں بھئی، تم نے مرغی کو ذبح کیوں نہیں کیا؟"

شاگرد نے عرض کی: "حضرت، مجھے کوئی ایسی جگہ نہ مل سکی جہاں کوئی دیکھنے والا نہ ہو۔ میں جس جگہ بھی گیا، وہاں اللہ تعالیٰ موجود تھا اس لیے مجبور ہو کر مرغی واپس لے آیا ہوں۔"

"تم نے دیکھ لیا کہ جتنی عقل میرے اس شاگرد میں ہے اتنی تم میں نہیں۔ اس لیے میں اسے زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔"

(اعزازی تحریر)

جولائی کا شمارہ بہت خوب صورت تھا، خاص طور پر کہانیوں میں احساس، ایک سکندر ایسا اور دشمن پڑھ کر ایک نیا احساس پیدا ہوا۔
(محمد عمیر عبدالحکیم، بہاول پور)

انکل! جولائی کا شمارہ بہت پسند آیا۔ کہانی "ایک سکندر ایسا......" بہت پسند آئی۔ بچوں کا انسائیکلو پیڈیا ایک اچھا سلسلہ ہے اسے جاری رکھیے۔ (راحت اسلم، گوجرانوالہ)

جولائی کے شمارے میں کہانیاں احساس، آبِ شیریں، دشمن اور ایک سکندر ایسا بہت اچھی تھیں۔ کیا میں ٹیپو سلطان کے بارے میں مضمون بھیج سکتا ہوں؟ (غلام صابر، اوکاڑا)

☆جی ضرور بھیجیے۔

جولائی کا شمارہ بہت اچھا تھا۔ کہانیوں میں احساس، آبِ شیریں اور جنگل کا بادشاہ بہت اچھی تھیں۔ (خرم اقبال، نوید اقبال سرگودھا)

کیسے ہیں آپ؟ ضرور گرمیوں میں آموں کا مزہ لوٹ رہے ہوں گے۔ اب رسالے کی بات کی جائے تو وہ ہمیشہ کی طرح مسکراتا اور ہنستا ہوا ملا۔ سرورق کو دیکھ کر گرمی دُور ہو گئی۔
(فصیحہ اشرف، مرید کے)

بھیا! آپ کو پیشگی ماہِ رمضان کی مبارک ہو۔ تحریروں میں شبِ برأت، آبِ شیریں، دشمن اور آندھی اور طوفان بہت پسند آئیں۔ (محمد اکبر جاوید، ڈیرہ غازی خان)

مجھے جولائی کا شمارہ بہت اچھا لگا۔ کہانیوں میں ایک سکندر ایسا، پنکو اور ونٹو اور دشمن بہت اچھی تھیں۔ (اخفاء ارم، ساہی وال)

جولائی کے شمارے میں مجھے کہانیاں سبز قمیص، دشمن، ایک سکندر ایسا اور احساس بہت پسند آئیں۔ (حسنین افضال، سرگودھا)

انکل! مجھے آپ سے شکایت ہے کہ میں دماغ لڑاؤ کے سلسلہ میں لگاتار حصہ لے رہا ہوں مگر جواب درست ہونے کے باوجود مجھے انعام نہیں دیا جاتا ہے مگر میں نا اُمید نہیں ہوں، میں اپنی کوشش جاری رکھوں گا۔ اور انعام حاصل کروں گا، ان شاء اللہ۔
(محمد ذیشان قمر، راول پنڈی)

☆سلسلہ دماغ لڑاؤ میں بہت سے بچوں کے جواب درست ہوتے ہیں، اس لئے انعام بذریعہ قرعہ اندازی دیا جاتا ہے۔

پنکو اور ونٹو اور کہانی سبز قمیص کا کوئی جواب ہی نہیں تھا۔ اگر آپ نے میرا خط شائع نہ بھی کیا تو میں رسالہ چھوڑنے کی بجائے پھر کوشش کروں گا۔ (زید احمد، لاہور)

☆آپ کی کوشش کام یاب ہو گئی ہے۔

مجھے جولائی کا شمارہ بہت اچھا لگا۔ اس میں مادرِ ملت، پنکو اور ونٹو اور ایک سکندر ایسا بہت اچھی کہانیاں تھیں۔
(معظمہ کفایت، ساہی وال)

مجھے جولائی کے شمارے میں ایسا مت کرو! اور آبِ شیریں کہانیاں بہت پسند آئیں۔ معلوماتِ عامہ اور بچوں کا انسائیکلوپیڈیا نے تو کمال کر دیا۔ میرے پسندیدہ اشعار کا سلسلہ بھی اچھا ہے۔
(حمنہ شعیب، راول پنڈی)

جولائی کے شمارے میں ایسا مت کرو، احساس اور بچوں کا انسائیکلوپیڈیا بہت اچھے لگے۔ (سلطان محمد ناصر، لورالائی)

جولائی کا شمارہ ملا۔ سرورق بہت خوب صورت تھا۔ کہانی آبِ شیریں نے پانی کی اہمیت کا احساس دلایا۔ ہم بہن بھائیوں نے پانی ضائع کرنا بند کر دیا ہے۔ (رقیہ ممتاز، نوشہرہ)

فرق تلاش کریں اور کھیل دس منٹ کا بہت اچھے سلسلے ہیں۔ (مومنہ رضوان، لاہور)

فرق تلاش کریں اور راستہ تلاش کریں جیسے سلسلے بچوں کی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخشتے ہیں۔ اسلامی معلومات بھی بچوں کو اعمالِ صالح کی ترغیب دیتی ہیں۔ (عمر فاروق، راول پنڈی)

جولائی کے شمارے میں ایک سکندر ایسا اور سبز قمیص سبق آموز کہانیاں تھیں۔ (عائشہ منور، جویریہ منور، اسلام آباد)

جولائی کا شمارہ بہت ہی خوب صورت لگا۔ کہانیوں میں احساس، سبز قمیص، ایک سکندر ایسا اور دشمن بہت ہی اچھی تھیں۔ انکل! جون کے شمارے میں ایک سوال تھا کہ اذان میں اللہ اکبر کتنی دفعہ آتا ہے۔ اس کا جواب چھ مرتبہ ہے لیکن آپ نے اس کا جواب چار مرتبہ لکھا ہے۔ (ہارون الرشید، جہلم)

☆ آپ کا جواب درست ہے۔ پروف کی غلطی سے **6** کی بجائے **4** لکھا گیا تھا۔

کیا ہم کسی انگریزی کہانی کا ترجمہ بھیج سکتے ہیں......؟ (عثمان علی رانجھا، میاں والی)

☆ آپ انگلش کہانی کا ترجمہ بھیج سکتے ہیں۔ ترجمے کے ساتھ اصل کہانی بھی بھیجیں۔

کہانیوں میں ایک سکندر ایسا، جنگل سے جنگل تک، ایسا مت کرو، احساس اور دشمن ٹاپ پر رہیں۔ آپ سلسلہ وار ناول کب شروع کریں گے؟ (رخسار خان، نوشہرہ)

☆جب بھی کوئی اچھا ناول ملا۔

مجھے جولائی کا شمارہ بہت اچھا لگا۔ خاص طور پر تحریریں دشمن، احساس اور مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح بہت اچھی تھیں۔ (احسن التقویم، سوات)

تعلیم و تربیت خوب صورت تحریروں اور رنگا رنگ صفحات سے مزین ایک بھرپور رسالہ ہے، بچوں کے ساتھ ساتھ بڑے بھی اس کو پسند کرتے ہیں۔ کہانی ہی کہانی میں بچوں کی تربیت اور اخلاقی اقدار سکھانے کے لیے یہ شمارہ اپنی مثال آپ ہے۔ (عابد فاروق، اٹک)

آپ تو شاید ہماری کہانیوں کو پڑھے بغیر ہی ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتے ہیں۔ اگر آپ ہماری حوصلہ افزائی کریں تو ہم بھی کچھ کر کے دکھا سکتے ہیں۔ (حفصہ ذہین، گوجرانوالہ)

☆موصول ہونے والی ہر کہانی پڑھی جاتی ہے، اچھی کہانی خود بخود رسالے میں جگہ بنا لیتی ہے۔

اس بار پنکو اور ونٹو، ایک سکندر ایسا اور جنگل کا بادشاہ سپر ہٹ کہانیاں تھیں۔ (ابو بکر احمد، عائشہ احمد، لاہور)

ان دنوں گرمیوں کی چھٹیاں ہیں اور ہمیں بہت سارا سکول کا کام بھی ملا ہے، مجھے جو وقت بھی ملتا ہے میں تعلیم و تربیت پڑھتی ہوں۔ اس کی کہانیاں اور نظمیں مجھے بہت پسند ہیں۔ (آمنہ علی، جہلم)

درسِ قرآن وحدیث، معلوماتِ عامہ اور بلاعنوان بہت دل چسپ سلسلے ہیں۔ (یسریٰ طارق، لاہور)

مفید مشغلے ایک مفید سلسلہ ہے۔ انکل! میری ایک گزارش ہے کہ آپ کارٹون کہانی اور شرارتی لکیریں والے سلسلے دوبارہ شروع کریں۔ (محمد عثمان قاسمی، جھنگ صدر)

بچوں کا انسائیکلوپیڈیا اور مفید مشغلے بہت اچھے سلسلے ہیں ان کو جاری رکھیے گا۔ (محمد مبین احمد، ساہی وال)

رکھوالے

نذیر انبالوی، لاہور

قمر اور اُس کے دوست باغ میں سیر کرتے ہوئے برگد کے درخت کے پاس جا کر رک گئے۔ قمر نے کہا:

"مجھ سے تو مزید چلا نہیں جاتا، بس اب برگد کے نیچے بیٹھ جاؤ۔"

"دُنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے قمر نے برگد کے نیچے ہی بیٹھنا ہوتا ہے، میں برسوں سے اِس کا یہ جملہ سن رہا ہوں کہ مجھ سے اب مزید چلا نہیں جاتا بس برگد کے نیچے بیٹھ جاؤ۔" تاج دین بولا۔

"تم بھی ہر روز یہی جملہ بولتے ہو۔" رب نواز نے تاج دین کو گھورتے ہوئے کہا۔

"بس اب ہمارے پاس کرنے کے لئے اور باتیں ہیں ہی نہیں، ہم سب ریٹائرڈ بوڑھوں کی اِس باغ میں ملاقات ہو جاتی ہے، اِس طرح صبح کے دو تین گھنٹے گزر جاتے ہیں پھر تو ہم سب اپنے بچوں اور پوتے پوتیوں کے رحم وکرم پر ہوتے ہیں۔ یہ برگد بھی تو ہمارا دوست ہے، ہم ہر روز اِس کے نیچے آ کر بیٹھتے ہیں اور ڈھیروں باتیں کرتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے بشیر پر کھانسی کا ایسا دورہ پڑا کہ وہ کھانس کھانس کر بے حال ہو گیا۔

"تمہیں کہا بھی تھا کہ حکیم اللہ وسایا کے پاس چلے جاؤ، تم ہو کہ میری بات سنتے ہی نہیں۔" قمر نے بشیر کی کمر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"کیسے جاؤں، کوئی لے کر بھی تو جائے، اکیلے مجھ سے جایا نہیں جاتا۔" بشیر نے کھانستے ہوئے بہت مشکل سے کہا۔

"میں تمہیں لے کر جاؤں گا۔"

"تم اِسے لے کر جاؤ گے، تم خود تو اپنی نئی عینک بنوانے کے لیے شاہ عالمی مارکیٹ تک جا نہیں سکتے، اِس کو کس طرح لے کر جاؤ گے۔" تاج دین کی بات سن کر قمر خاموش ہو گیا۔ تاج دین نے بات جو سچ کہہ دی تھی۔ بشیر کی کھانسی کی آواز سن کر دائیں کونے میں بنے ایک چھوٹے سے کمرے سے نکل کر محمد علی بابا ایک مٹی کے پیالے میں پانی لے کر آگے بڑھا۔

"لے پانی پی لے۔"

بشیر نے شکریہ ادا کر کے پانی کا پیالہ منہ سے لگا لیا۔ محمد علی بابا ایک مدت سے اِس باغ میں مالی کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ انہیں محکمے نے ریٹائرڈ بھی کر دیا مگر اِس کے باوجود وہ بغیر معاوضے کے باغ میں کام کر رہے تھے۔ یہ باغ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا۔ انہیں یوں تو باغ کے ہر درخت سے پیار تھا مگر جو پیار انہیں برگد کے درخت سے تھا وہ کسی اور درخت سے نہ تھا۔ برگد کا درخت اُن کے ہاتھوں کا لگایا ہوا تھا۔ وہ اب تک اُس کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ صبح کے وقت ریٹائرڈ لوگوں کے اِس گروہ میں محمد علی بابا بھی شامل ہو جاتے تھے۔ وہ کافی دیر تک گزرے وقت کی باتیں کرتے رہتے اور پھر ایک دُوسرے کو الوداع کہہ کر اپنی اپنی راہ لیتے۔ ان کے جاتے ہی محمد علی بابا بھی اپنے کام میں مصروف ہو جاتے۔ بوڑھوں کے رخصت ہوتے ہی برگد اپنے اِردگرد کھڑے اپنے دوستوں آم، شہتوت اور جامن کے درختوں کو مخاطب کرتا:

"میں ہر صبح ان بوڑھوں کا انتظار کرتا ہوں، ان کی باتیں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ جس دن یہ نہ آئیں تو میں اداس ہو جاتا ہوں۔"

"تم تو خوش قسمت ہو، تمہارے سائے تلے ہر وقت لوگوں کا ہجوم رہتا ہے۔ تمہاری گھنی چھاؤں ہر ایک کو تمہاری طرح کھینچ لاتی ہے۔" آم کے درخت نے کہا۔

"اِس میں میرا تو کوئی کمال نہیں، یہ تو اللہ تعالیٰ کی مجھ پر عنایت ہے، اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسا بنایا ہے تو لوگ میری چھاؤں میں آ کر بیٹھتے ہیں۔"

"برگد بھیا! تم ٹھیک کہتے ہو۔" کسی درخت کے بولنے سے قبل برگد کی شاخ پر بنے گھونسلے سے ایک چڑیا بولی۔

وہ انہی باتوں میں مصروف تھے کہ سائیکل پر بچوں کے کھلونے بیچنے والا گھنٹی بجاتے ہوئے برگد تلے آ گیا۔ ریاض گھڑی پر وقت دیکھتے ہوئے بڑبڑایا:

"یوسف نہ جانے کہاں رہ گیا ہے!"

"یہ بھالو کتنے کا ہے؟" ایک آدمی نے جس نے گود میں تین چار سال کا ایک بچہ اٹھا رکھا تھا، کھلونے والے کو مخاطب کیا۔

"صرف پچاس روپے کا۔"

"کچھ رعایت کر دو، یہ کالا بھالو دے دو۔"

"باؤ جی! صبح صبح کا وقت ہے، میں نے آپ کو جائز قیمت ہی بتائی ہے۔" ریاض نے بھالو دکھاتے ہوئے کہا۔

"اچھا یہ بھالو دے دو۔"

ریاض گاہک کو بھالو دے کر فارغ ہوا تو یوسف بھی سائیکل کی گھنٹی بجاتے ہوئے اُس کے سامنے موجود تھا۔

"آج اتنی دیر کہاں لگا دی؟"

"بڑی سڑک بند تھی۔" یوسف نے بتایا۔

"بڑی سڑک کیوں بند تھی؟" ریاض نے پوچھا۔

"کوئی بڑا افسر وہاں سے گزرنے والا تھا۔"

"ہمیں کیا لینا بڑے افسر سے، ہم نے تو محنت مزدوری کرنی ہے، ہم اس برگد کے نیچے کھڑے ہو کر اپنا کام شروع کرتے ہیں اور سارا دن گھوم پھر کر اِسی برگد کے نیچے آ کر کام ختم کرتے ہیں۔" ریاض برگد کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہاں، برگد کے پاس آنے کی ایسی عادت پڑ گئی ہے کہ جس دن یہاں آنے کا ناغہ ہو جائے تو دل اداس ہو جاتا ہے۔"

"آؤ ناشتہ کرتے ہیں اور پھر کام پر نکلتے ہیں۔"

پھر دونوں نے ایک کپڑا بچھا کر ناشتہ کیا اور شام کے وقت دوبارہ اسی جگہ ملنے کا کہہ کر سائیکلوں کی گھنٹیاں بجاتے ہوئے مخالف سمت میں نکل گئے۔

برگد کو اپنی خوش قسمتی پر بہت ناز تھا۔ وہ ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا رہتا تھا۔ اُسے خوشی اس بات کی تھی کہ وہ انسانوں کے کام آ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک قریبی ہوٹل میں پکوائی کا کام کرنے والا اعجاز برگد کے گھنے سائے تلے آ گیا۔ گرمی کے باعث وہ پسینے میں شرابور تھا۔ اُس نے رومال سے پسینہ خشک کیا اور پھر ایک کپڑا بچھا کر برگد کے نیچے لیٹ گیا۔ برگد کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں جلد ہی اُس کی آنکھ لگ گئی۔ وہ کچھ دیر مزید سونا چاہتا تھا، مگر ہوٹل سے ایک لڑکا اُسے بلانے کے لئے آ گیا تھا۔

"میرے بچو! میں تمہارے لیے خوراک لینے جا رہی ہوں، گھونسلے میں شرارتیں مت کرنا۔" گھونسلے میں چڑیا اپنے بچوں کو سمجھا رہی تھی۔

"اچھا امی جان! ہم شرارتیں نہیں کریں گے۔"

"ہمارا گھونسلہ بہت محفوظ جگہ پر ہے، یہاں ہمیں کوئی خطرہ نہیں۔ میں نے اِسی گھونسلے میں آنکھ کھولی تھی۔ مجھے اِس برگد سے بہت پیار ہے۔" چڑیا کی باتیں سن کر برگد خوش ہو گیا تھا۔

"چڑیا بہن! تم بے فکر ہو کر جاؤ، اگر کوئی دشمن تمہارے بچوں کی طرف میلی آنکھ سے دیکھے گا تو میں اپنی شاخیں ہلا ہلا کر اُسے بھگا دوں گا۔"

"شکریہ برگد بھیا! شکریہ۔" چڑیا یہ کہہ کر پُھر سے اُڑ گئی۔ گھونسلے میں چڑیا کے بچے چوں چوں کرنے لگے۔

دوپہر کی کڑی دھوپ میں سائیکل پر فالسے بیچنے والا برگد کے نیچے آ کھڑا ہوا۔ برگد کی گھنی چھاؤں میں اُسے سکون ملا تھا۔ وہ کافی دیر وہیں کھڑا فالسے بیچتا رہا۔

شام کے وقت کچھ بچے باغ میں آ کر برگد کے نیچے رسی پھلانگنے لگے۔ ایک بچہ شہزاد بار بار اچھل کر برگد کی لٹکتی ہوئی شاخوں کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اِسی کوشش میں زمین پر ایسا گرا کہ اپنا پاؤں پکڑ کر بیٹھ گیا۔ رسی پھلانگنے والے بچے شہزاد کی طرف بڑھے۔

"ہائے میرا پاؤں۔" شہزاد نے اپنا پاؤں پکڑ رکھا تھا۔

"لگتا ہے اسے موچ آگئی ہے۔" وقار نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"مجھ سے چلا نہیں جا رہا، مجھے گھر تک پہنچا دو۔" شہزاد نے چلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

آج تو شہزاد نے سارا مزا کرکرا کر دیا ہے ورنہ ہر روز برگد کے نیچے کھیل کر بہت مزا آتا ہے۔" ایاز بولا۔

"چلو اب شہزاد کو اِس کے گھر چھوڑ آتے ہیں۔" وقار کے کہنے پر پھر سارے دوست شہزاد کو سہارا دے کر باغ سے لے گئے۔

---☆☆☆---

رات سے موسلا دھار بارش جاری تھی۔ شہر میں ہر طرف جل تھل ہو چکا تھا۔ گرمی کے ستائے ہوئے لوگوں نے مون سون کی پہلی بارش پر سکھ کا سانس لیا تھا۔ بارش سے ہر چہرہ خوشی سے کھل گیا تھا۔ یہ بارش جہاں ہر ایک کو خوشی دے گئی وہاں برگد کو محمد علی بابا کی وفات کا غم دے گئی تھی۔ محمد علی بابا اپنے کچے سے مکان میں سوئے ہوئے تھے کہ شدید بارش کے باعث چھت اُن پر آگری تھی۔ محمد علی بابا کی وفات پر برگد کو بہت دکھ ہوا تھا۔ اُس سے محبت کرنے والا دُنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ اِس باغ میں یوں تو مالی بہت تھے، مگر اُن میں محمد علی بابا جیسا کوئی نہیں تھا۔ اب کوئی مالی برگد کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ سب مالی باغ میں اُس وقت تک کام کرتے دکھائی دیتے تھے جب

تک اُن کا نگران وہاں موجود ہوتا تھا جیسے ہی نگران کسی دُوسرے باغ کی طرف جاتا سب مالی کام چھوڑ کر بیٹھ جاتے۔ باغ کے کئی درخت مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کے باعث سوکھ گئے تھے۔

یہ باغ جب لگایا گیا تھا تو شہری آبادی سے خاصے فاصلے پر تھا، مگر اب وقت کے ساتھ ساتھ یہ شہر کے درمیان میں آگیا تھا۔ بائیں طرف ایک بڑی سڑک پر ہر وقت ٹریفک کا رش رہتا تھا۔ بڑی سڑک گاڑیوں کی تعداد کے اعتبار سے ناکافی ہو گئی تھی۔ جب اس ٹریفک کا حل نکالنے پر غور کیا گیا تو ماہرین کی نظر باغ پر پڑی۔ باغ کے داخلی راستے سے کچھ جگہ لینے سے سڑک کو توسیع دی جاسکتی تھی۔ چند مہینوں کے بعد کچھ لوگ اپنے آلات لے کر باغ اور اُس کے ساتھ والی سڑک کی پیائش کرنے لگے۔ باغ کے سارے درخت اور پرندے اِس صورتِ حال سے پریشان تھے۔ ایک شخص پیائش کرتا جارہا تھا جب کہ دُوسرا شخص ایک کاغذ پر کچھ لکھتا جارہا تھا۔ وہ کافی دیر تک یہ کام کرتے رہے۔

"کام آسانی سے ہو جائے گا۔" وقاص نے کاپی میں لکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے، باغ کے زیادہ درخت کاٹنے نہیں پڑیں گے۔" پیائش کرنے والا شخص ظہیر بولا۔

"اگر یہ برگد کا درخت راستے سے ہٹ جائے تو کام مزید آسان ہو جائے گا۔"

"چلو ہم رپورٹ بنا کر دے دیتے ہیں جیسا فہیم صاحب کہیں گے ویسا ہم کرلیں گے۔" ظہیر نے کہا۔

دونوں کی باتیں سن کر برگد چکرا کر رہ گیا تھا۔

"برگد بھیا! تمھیں کچھ نہیں ہو گا، پہلے بھی کئی بار اس طرح کے منصوبوں کی باتیں باغ میں ہوتی رہی ہیں، مگر آج تک کسی منصوبے پر عمل نہیں ہو سکا۔" آم کے درخت نے برگد کو تسلی دی۔

"مجھے یقین ہے میرے پیار کرنے والے یوں مجھے کاٹنے نہیں دیں گے، سب میرے سامنے دیوار بن کر کھڑے ہو جائیں گے، مجھے یقین ہے ایسا ہی ہو گا۔" برگد پُرعزم لہجے میں بولا۔

جامن اور شہتوت کے درخت بھی برابر اس کو تسلی دے رہے تھے۔ اخبار میں جب سڑک کو چوڑا کرنے کی خبر شائع ہوئی تو برگد کو یقین تھا کہ لوگ اس پر ردعمل ظاہر کریں گے۔ برگد کٹنے پر احتجاج کریں گے مگر ایسا نہ ہوا۔ بوڑھے حسبِ معمول برگد کے سائے تلے بیٹھتے تھے، مگر برگد کی انہیں کوئی فکر نہیں تھی۔ اُن کے پاس صرف اور صرف اپنی باتیں تھیں۔ بشیر نے کھانستے ہوئے کہا:

"سنا ہے سڑک کو چوڑا کیا جارہا ہے۔"

"ہاں سنا تو یہی ہے۔" قمر بولا۔

"سڑک میں باغ کا کچھ حصہ بھی آئے گا، میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ یہ برگد بھی زد میں آئے گا۔" تاج دین نے اپنی چھڑی گھماتے ہوئے کہا۔

اچھا، یہ برگد کٹ جائے گا، چلو ہم کسی اور درخت کے نیچے بیٹھ جائیں گے۔" رب نواز کی بات سن کر برگد ہل کر رہ گیا۔

"کیا تم لوگ میرے لیے کچھ بھی نہیں کرو گے؟ کیا تم مجھے کٹنے سے نہیں بچاؤ گے؟ بولو جواب دو، کیا میرے کٹنے پر تم سب خاموش رہو گے؟"

برگد بولتا رہا، مگر انسان کب اس کی بات سنتے اور سمجھتے تھے۔

سائیکلوں پر کھلونے بیچنے والے یوسف اور ریاض ہر روز برگد کے پاس آتے، اِس کے سائے میں ناشتہ کرتے، برگد اُن کو مخاطب کرتا، مگر یہ لوگ بھی خاموش ہی رہتے۔ برگد نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اِس سے فائدہ اٹھانے والے اس کے ساتھ ایسا سلوک کریں گے۔ ہر آنے والا دن برگد کی پریشانی میں اضافہ کر رہا تھا۔ سڑک کی توسیع کی کاغذی کارروائی پر کام تیزی سے جاری تھا۔ ہر روز کوئی نہ کوئی معائنہ ٹیم باغ میں آتی تھی۔ برگد جب ان لوگوں کو دیکھتا تو بے اختیار اُسے محمد علی بابا یاد آجاتے تھے۔ آج اگر وہ زندہ ہوتے تو کسی کی مجال نہ ہوتی کہ

کوئی اُس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکتا۔ وہ خود کو بہت بے بس اور مجبور محسوس کر رہا تھا۔ برگد جب بھی زبان کھولتا اُس کی آواز گاڑیوں کے شور میں دب کر رہ جاتی۔ باغ میں کوئی بھی نہ تھا جو اُس کی بات سنتا۔

''امی جان! جب برگد کا درخت کٹ جائے گا تو ہم کہاں جائیں گے؟'' چڑیا کے بچے نے چوں چوں کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہم کسی دُوسرے درخت پر چلے جائیں گے۔'' چڑیا کی بات سن کر برگد نے فوراً کہا:

''کیا تم اور تمہارے بچے میرے کٹنے پر احتجاج نہیں کرو گے؟ کیا تم لوگ مجھے خاموشی سے کٹنے دو گے؟''

''میں ننھی سی جان بھلا کر بھی کیا سکتی ہوں، میں اور میرے بچے بے بس ہیں، ہمیں اپنی فکر ہے کہ تمہیں کچھ ہو گیا تو ہمارا کیا بنے گا۔'' چڑیا بولتی چلی گئی۔

برگد نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کے چاہنے والے اس کے ساتھ ایسا سلوک کریں گے۔ وہ تو اپنی قسمت پر نازاں تھا۔ اس کے اِردگرد ہر وقت پیار کرنے والوں کا رش رہتا تھا۔ وہ اب ہر وقت خاموش اور اداس رہنے لگا تھا۔ اُس کے بچنے کی ہر اُمید دم توڑتی جا رہی تھی۔ کوئی ایک آواز بھی ایسی سنائی نہیں دے رہی تھی جو اُس کے حق میں ہو۔ اِس کے سائے میں بیٹھنے کے لئے اب بھی بہت سے لوگ آتے تھے۔ کسی کو اِس بات کی فکر نہ تھی کہ کل جب یہ گھنا سایہ اُن کے سروں سے اٹھ جائے گا تو وہ کہاں جا کر کڑی دھوپ کا مقابلہ کریں گے۔ سب اپنی اپنی کھال میں مست تھے۔ کاغذی کارروائی مکمل ہوتے ہی ایک دن چونے سے باغ کے اُس حصے کی نشان دہی کر دی گئی جسے سڑک کا حصہ بنتا

تھا۔ اس حصے میں صرف ایک درخت آتا تھا، اور وہ درخت تھا گھنا سایہ دار برگد، سب کو سایہ بانٹنے والا برگد۔ چڑیا بھی اپنے بچوں کو لے کر کسی اور درخت پر اپنا گھونسلہ بنا کر بیٹھ گئی تھی۔ برگد خود کو تنہا محسوس کر رہا تھا۔ آم، جامن اور شہتوت کے درخت برابر اس کی دل جوئی کرنے میں مصروف تھے، لیکن برگد مایوسی کے اندھیرے میں گم ہوتا جا رہا تھا۔ سڑک بنانے کے لیے مشینری باغ کے داخلی دروازے کے پاس پہنچا دی گئی تھی۔ برگد کاٹنے کے لئے صبح کے وقت لوگوں نے آنا تھا۔ وہ رات برگد نے بہت مشکل سے کاٹی تھی۔ برگد کے سائے میں بیٹھنے والے مشینری کو دیکھ کر اس کی طرف نہیں بڑھ رہے تھے۔ ہر وہ شخص جو برگد کے سائے میں بیٹھتا تھا، باغ میں ضرور آیا، مگر وہ برگد کو بچانے کے لئے کچھ نہیں کر رہا تھا۔ برگد کو اپنی زندگی کا وقت کم لگ رہا تھا۔ ہر لمحہ موت اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔

دس بجے کے وقت برگد کو کاٹنے کے لئے لوگ آگے بڑھے تو اُن کے سامنے ایک آہنی دیوار کھڑی تھی۔ یہ دیوار برگد کے سامنے سینہ تان کر کھڑی ہو گئی تھی۔ آہنی دیوار کی شکل اختیار کرنے والے بچے وہ تھے جو برگد کے نیچے کھیلتے تھے۔ برگد اُن کو دیکھ کر خوش ہو گیا تھا۔ اُسے کامل یقین ہو گیا تھا کہ اُس کے رکھوالے اُسے بچانے کے لیے آگئے ہیں۔ بچوں نے برگد کے حق میں نعرے لگائے تو ان نعروں کو سن کر اور بھی کئی لوگ اُن کے ساتھ آ کھڑے ہوئے، اب برگد کاٹنے والے کم اور برگد کو بچانے والے زیادہ تھے۔ بچوں کے نعروں نے لوگوں میں جوش پیدا کر دیا تھا۔ اب برگد کے چاروں طرف اُس کو بچانے والے محافظ کھڑے تھے۔ یہ احتجاج دیکھ کر برگد کاٹنے والے واپس چلے گئے۔

بچوں نے برگد بچانے کی جس تحریک کا آغاز کیا تھا وہ اب زور پکڑتی جا رہی تھی۔ کئی دنوں تک برگد بچاؤ مہم جاری رہی۔ آخر انتظامیہ نے سڑک کی توسیع کے لئے باغ میں سے جگہ لینے کے بجائے ٹریفک پر قابو پانے کے لیے ایک پل بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے سے لوگ برگد کی گھنی چھاؤں سے محروم ہونے سے بچ گئے۔ بچے اپنی کام یابی پر بہت خوش تھے، جب وہ برگد کی گھنی چھاؤں تلے آئے تو برگد بھی انہیں دیکھ کر خوش ہو گیا تھا۔

برگد نے بچوں کو دُعائیں دیتے ہوئے کہا:

"جس طرح تم میرے رکھوالے بنے ہو، اِسی طرح اپنے وطن کے رکھوالے بھی بنو اور پاک وطن کے دشمنوں کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن جاؤ، جس قوم کے رکھوالے بچے ہوں اُس قوم کو کوئی آنچ نہیں آسکتی۔"

---☆☆---

اعزاز

نیشنل بک فاؤنڈیشن (اسلام آباد) کے زیرِ اہتمام منعقدہ مقابلہ "فروغِ بچوں کا ادب" سال 2010ء کے نتائج کا اعلان کر دیا ہے۔ نتائج کے مطابق "تعلیم و تربیت" کے مستقل لکھاریوں نذیر انبالوی کو اُن کے ناول "روشنی" پر اوّل انعام معہ چالیس ہزار روپے، غلام حسین میمن کو مسودہ "راہِ وفا کے مسافر" پر چوتھا انعام معہ دس ہزار روپے اور محمد فاروق دانش کو اُن کے مسودہ "دادا جان مان گئے" پر چوتھا انعام معہ دس ہزار کا حق دار قرار دیا گیا ہے۔

ادارہ ان لکھاریوں کی کام یابی پر مبارک باد پیش کرتا ہے۔

ستمبر 2010 کے شمارے کی متوقع تحریریں

رحمت کا فرشتہ	حسن ذکی کاظمی
منصوبہ ساز	اشتیاق احمد
وہ ایک نیکی!	نذیر انبالوی
سلوک	علی اکمل تصور
عید خوشیوں کا تہوار	نسرین شاہین
دھوپ کے بعد	عظمیٰ تسنیم
نیا جوڑا	راشد علی

"چچا تیز گام افطاری میں گئے"

ہونہار مصور

پرچم پاکستان کا

تصاویر صرف اُفقی رخ میں ہی بنائیں

حمیرا کریم، ملتان (پہلا انعام: 175 روپے کی کتب)

عفیفہ عارف، لاہور (دُوسرا انعام: 150 روپے کی کتب)

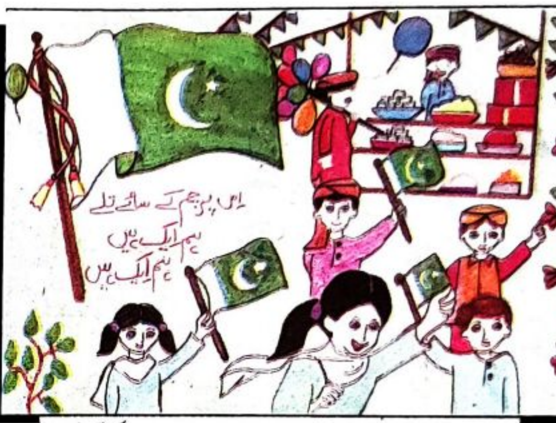

عائدہ احمد، لاہور (تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

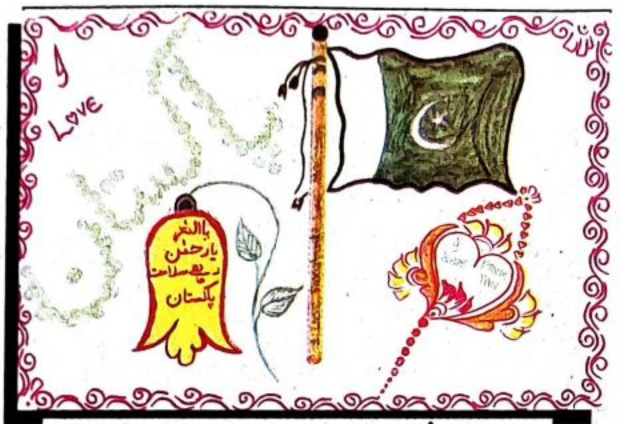

عارفہ ثناء، فیصل آباد (چوتھا انعام: 100 روپے کی کتب)

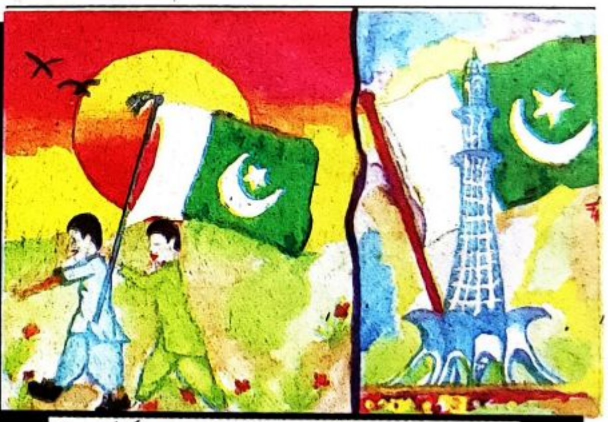

رقیہ ممتاز، نوشہرہ (پانچواں انعام: 90 روپے کی کتب)

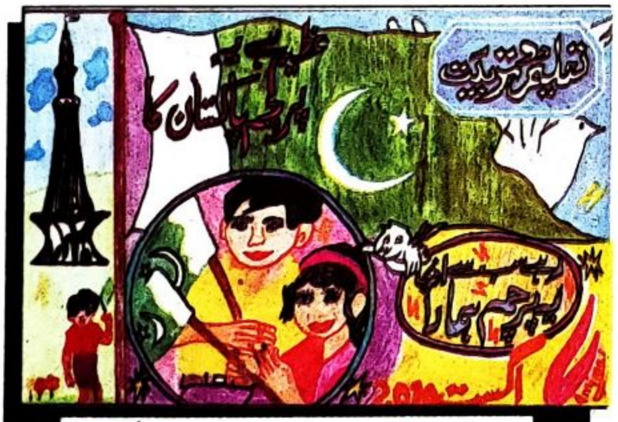

امیمہ عثمان، ہری پور ہزارہ (چھٹا انعام: 75 روپے کی کتب)

کچھ اچھے مصوروں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: افراح عبدالعلیم، بنت محمد طارق عبد الباری، حنان خان، سلمان حبیب، انس نسیم خان، (کراچی)۔ عریشہ سلیم، ماہ نور سیف، حمزہ کامران، حیا فاطمہ، ارسلان خالد، عائشہ احمد، عیشہ ادریس، عبدالرحمان، محمد شائم، بارعہ، فارعہ، مریم ندیم، محسن علی رضا (لاہور)۔ دُرِ شہوار، ہما ممتاز، ذیشان انجم، علینہ علی، فیصل عثمان، سحر انجم (آزاد کشمیر)۔ طیبہ رشید (لسبیلہ)۔ تقی رضوان (ایبٹ آباد)۔ زُنیر شوکت، علی زیب خالد، احمد منصور، قاسم لقمان (گجرات)۔ عروسہ حنیف، ربیعہ حنیف، پاکیزہ حسین (حیدر آباد)۔ ماریہ علی، حمنہ شعیب، عالیہ علی، رابعہ آصف۔ محمد معاذ، اسماء احسان (راول پنڈی)۔ زینب وقار (اٹک)۔ ماریہ کائنات، طاہرہ حواز، اسماء رحمان (میاں والی)۔ حنیہ بتول (ملتان)۔ ثناء احمد مغل، حنا احمد مغل (رحیم یار خان)۔ فتاب کرن، سعدیہ احمد، امان اللہ احمد (لالہ موسیٰ)۔ فرح شہزاد، علی شہروز، سارہ طارق (فیصل آباد)۔ عشاء فاطمہ (حافظ آباد)۔ جویریہ منور، رمشا نوید، آمنہ شاہد، مندوۃ النعیم، دُعا فاطمہ (اسلام آباد)۔ حافظ محمد سلطان فاروقی (قصور)۔ زوہیب خان (نوشہرہ)۔ مجیعہ شعیب (بہاول پور)۔ طیبہ طفیل، ماہ نور ملک، عنبر ادیب (گوجرانوالہ)۔ آسیہ نواز (سرگودھا)۔

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور سکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

آخری تاریخ 8 اگست

ستمبر کا موضوع: عید کارڈ

آخری تاریخ 8 ستمبر

اکتوبر کا موضوع: پھولوں کی دُکان

بلاعنوان

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجیے اور 500 روپے کی کتب لیجیے۔
عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10 اگست 2010ء ہے۔

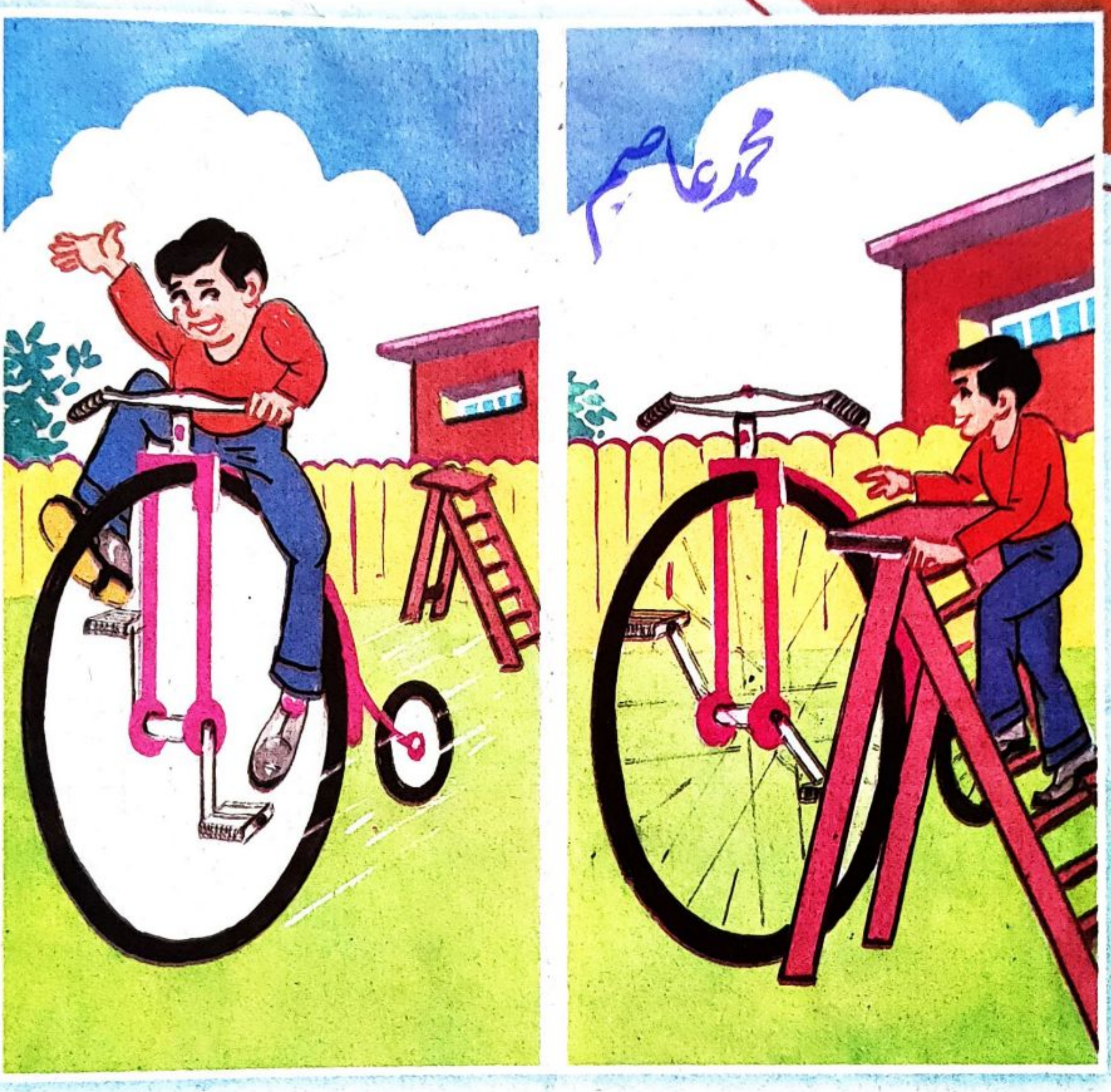

جولائی 2010ء کے "بلاعنوان کارٹون" کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں سے مجلسِ ادارت کو **200** عنوانات پسند آئے اور یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی **500** روپے کی کتب کے انعامات کے حق دار قرار پائے۔

☆ زینب عمران سہیل، اوکاڑا (جلدی پی لو چائے، کہیں بجلی نہ چلی جائے۔)

☆ سید جازل احمد، کراچی (مان نہ مان، میں تیرا مہمان)

☆ قیوم عابد، لاہور (میٹھی میٹھی چائے کے ساتھ، میٹھی میٹھی خبریں)

☆ حسنین افضال، سرگودھا (اچھی خبر سنانے پر چائے کا ایک کپ فری)

☆ محمد صہیب، اسلام آباد (ٹی بریک!)

دل چسپ اور سبق آموز کہانیاں

پیارے بچوں کے لیے پیاری پیاری کہانیاں

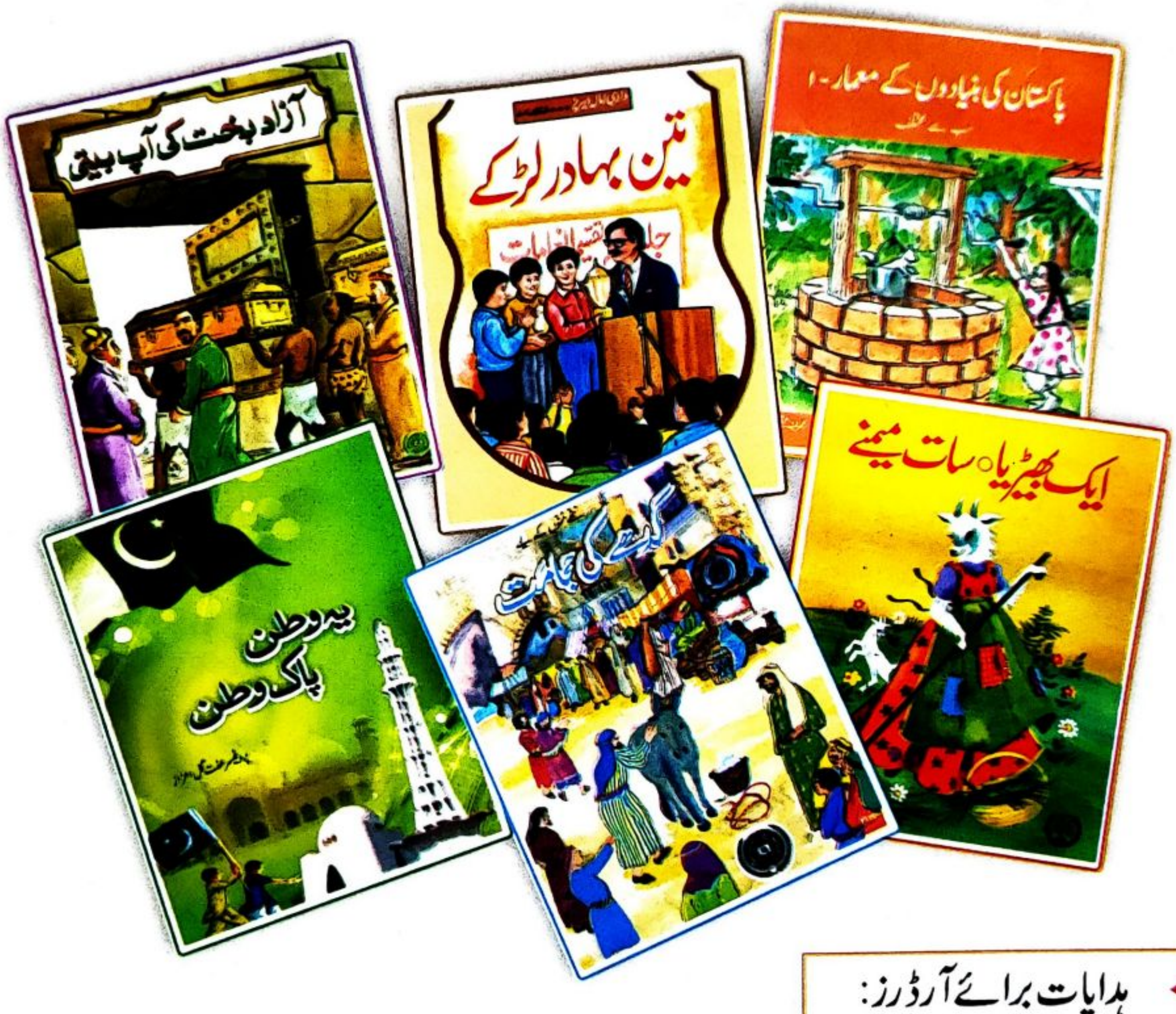

ہدایات برائے آرڈرز:

- پنجاب: 60 شاہراہ قائدِ اعظمؒ، لاہور 042-111-626262
- سندھ اور بلوچستان: پہلی منزل، مہران ہائیٹس، مین کلفٹن روڈ، کراچی 35830467 - 021-35867239
- خیبر پختونخوا، اسلام آباد، آزاد کشمیر اور قبائلی علاقے: 277 پشاور روڈ، راول پنڈی 5124897 - 051-5124970

فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی

ہمارے شورومز میں آپ کے لیے انتہائی دیدہ زیب اور معیاری کتابیں دستیاب ہیں

The Taleem-o-Tarbiat, Lahore
CPL NO. 123 PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES